ایک مختصر مقالہ پڑھا تھا، جواب رسالہ کی صورت میں شائع ہوا ہے، اس میں امیر خسرو کے حالات و سوانح، امرا و سلاطین سے ان کے تعلقات اور انکی تصنیفات نظم و نثر پر تبصرہ کیا گیا ہے، قران السعدین میں سلطان ناصر الدین اور اس کے فرزند معز الدین کیقباد کی نوک جھونک اور پھر صلح اور مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے دس خصوصیات بیان کیے گئے ہیں، مرتب نے ان سب کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جو خصوصیت سے پڑھنے کے لائق ہیں، رسالہ مختصر ہونے کے باوجود پُر مغز اور جامع ہے۔

کرل :۔ مترجمہ جناب حسرت سہروردی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۵۲ مجلد قیمت للعہ پتہ: ساہتیہ اکاڈیمی، نئی دہلی۔

مذکورہ بالا کتاب سنسکرت سے بھی کچھ پہلے کے ایک حکیم ترو والور کا صحیفۂ اخلاق و موعظت ہے جو تامل زبان میں تھا، اسکی ابتدا حمد باری سے اور خاتمہ عشق و محبت اور ہجر و وصل پر ہوتا ہے، یہ آخری حصہ عام کتاب کے مقابلہ میں زیادہ شوخ اور رنگین ہے، درمیان میں ۱۳۳ عنوانات کے تحت فضائل و رذائل اخلاق کا ذکر ہے، مصنف کو جین مذہب کا پیرو بتایا جاتا ہے جین مذہب ہندو مت سے متاثر ہے اسلیے اس کتاب کے مندرجات میں ہندو مت کی بھی بعض باتیں آگئی ہیں، لیکن وہ اخلاقی نوعیت کی ہیں، اور تقریباً سبھی مذاہب میں مشترک ہیں، اس لیے ان کا مطالعہ سب کے لیے مفید اور سبق آموز ہوگا، ترجمہ سلیس اور شگفتہ ہے۔

مقالات شریعت و حکمت : مولانا حکیم محمد زمان صاحب قاسمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۰، مجلد قیمت عہ پیسہ، پتہ: مولوی محمد عرفان قاسمی دواخانہ ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱۲

یہ مختصر مگر مفید علمی، مذہبی اور معاشرتی مضامین کا مجموعہ ہے جو سب طبعزاد ہیں، صرف ایک مضمون شاہ ولی اللہ صاحب کی تفہیمات سے ماخوذ ہے، ایک مضمون سیرت نبوی سے متعلق بھی ہے، یہ سب مضامین اخبار کے لیے لکھے گئے تھے اس لیے عام فہم اور آسان زبان میں ہیں اور اوسط درجہ کے پڑھے لکھے مسلمانوں کے پڑھنے کے لائق ہیں۔

"ض"

جلد ۹۹ ماہ شوال المکرم ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۷ء عدد ۲

مضامین

شذرات

عزیز محترم مولانا محمد عمران خاں صاحب مدتوں سے بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے، مگر ایسے اسباب پیش آتے گئے کہ اس سے محرومی رہی، اس سال اسکی توفیق نصیب ہوئی بستی نظام الدین کے بعد غالباً سب سے بڑا سالانہ تبلیغی اجتماع بھوپال میں ہوتا ہے جس میں ہندوستان کے ہر حصے کے لوگ شریک ہوتے ہیں، تاج المساجد کے آس پاس ایک میلہ سا لگ جاتا ہے اور ایک پوری بستی آباد ہو جاتی ہے جس میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں ملتی ہیں، تاج المساجد میں تین دن تبلیغی مواعظ کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پوری فضا دینی ترانوں سے معمور رہتی ہے جس سے ہر شخص بقدر ذوق وطلب حصہ پاتا ہے، آخری دن بڑی موثر دعا پر یہ مبارک اجتماع ختم ہوتا ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں جماعتیں روانہ ہوتی ہیں، معلوم ہوا سورت کے اجتماع کی وجہ سے جو ایک ہی ہفتہ پہلے ہوا تھا اس سال بھوپال میں مجمع کم تھا، پھر بھی میرے تصور سے زیادہ تھا،

اس دور میں سب سے بڑی تبلیغ خود مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہے، اجتماعی شکل میں اس فریضہ کو مسلمان مدت سے فراموش کر چکے تھے، تبلیغی جماعت نے پھر اس کو زندہ کیا، اس کا سب سے بڑا اور نمایاں فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دینی جمود میں حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے دین کی راہ میں نکلنا اور مشقت برداشت کرنا سیکھا، یہ اسی جماعت کا فیض ہے کہ بڑے بڑے نازپروردہ، اصحاب ثروت و وجاہت اپنا عیش و آرام چھوڑ کر دنیا بھر میں اپنے خرچ سے تبلیغ دین کے لیے مشقتیں برداشت کرتے پھرتے ہیں جس کی نظیر ادھر صدیوں سے نہیں ملتی،

اور اس کا نظم ایسا ہے کہ جماعتوں میں نکلنے کے بعد خود یہ کام اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، اس اجتماع میں شرکت کی بدولت بہت سے احباب و اکابر سے ملاقات ہوئی، شیخ التبلیغ مولانا انعام الحسن صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا،

~~~~~~~~~~

اس سفر کے سلسلہ میں ایک اہم بات کا ذکر ضروری ہے، تاج المساجد ہندوستان کی نہایت عظیم الشان مسجد ہے، اس میں وہ حسن و تناسب تو نہیں جو دلی کی جامع مسجد میں ہے لیکن وسعت میں اس سے زیادہ ہے، اس کی تعمیر نواب شاہجہاں بیگم نے شروع کی تھی، مسجد کی اصل عمارت اور شرقی و جنوبی سمت کے دالان انکی زندگی میں مکمل ہو گئے تھے، صدر دروازہ اور شمالی سمت کا دالان زیر تعمیر تھا کہ شاہجہاں بیگم کا انتقال ہو گیا، اور نواب سلطان جہاں بیگم ان کی جانشین ہوئیں، نواب شاہجہاں بیگم کے بعد بھوپال کی سیاست میں ایسا انقلاب آیا کہ تاج المساجد بھی اس سے نہ بچ سکی، اور نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کی تکمیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، اور وہ نامکمل رہ گئی، اس کا جو سامان جہاں تھا وہیں پڑا رہ گیا، رفتہ رفتہ مسجد ایک ویرانہ، وحشی جانوروں کا مسکن اور بدمعاشوں کا اڈہ بن گئی، مولانا محمد عمران خاں نے جب بھوپال میں مستقل قیام اختیار کیا تو اس مسجد کی آبادی کی طرف توجہ کی اور اس کے ملبے جھاڑیوں اور دالانوں کو صاف اور ان میں ضرورت کے مطابق ترمیم کر کے ان میں عربی کا ایک مدرسہ قائم کر دیا، یہ دالان اتنے وسیع ہیں کہ ان میں درسگاہ، بورڈنگ، کتب خانہ اور ان سے متعلقہ جملہ دفاتر سب ...... آ گئے، اور جو مسجد ملبے کا ڈھیر اور جھاڑیوں کا جنگل تھی ایک صاف ستھری مسجد اور دار العلوم میں تبدیل ہو گئی جس میں دینی علوم کا سرچشمہ جاری ہے،

~~~~~~~~~~

مسجد سے متصل اس کے جنوبی سمت زمین کا ایک وسیع قطعہ ہے، جو مسجد پر وقف ہے عمران خاں صاحب نے جب اس کو مسجد کے کام میں لانا چاہا تو حکومت نے روک دیا کہ وہ اسکی

ملک ہے، کئی سال سے اس کا مقدمہ چل رہا ہے، جس پر ہزاروں روپئے صرف ہو چکے ہیں، ابھی یہ مقدمہ چل رہا ہے کہ خانصاحب نے مسجد کے شمالی سمت کے دالان اور صدر دروازے کو مکمل کرانے کی ہمت کی جس میں کئی لاکھ کا صرف ہے، موجودہ حالات میں اتنی بڑی ہمت کرنا ان ہی کا کام ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمان قوم مسجد کی تعمیر میں بڑی عالی حوصلہ واقع ہوئی ہے، آجتک کسی مسجد کی تعمیر محض سرمایہ کی کمی کی وجہ سے نہیں رکی، اور تاج المساجد کی تو تاریخی حیثیت و اہمیت ہے، اگر وہ مکمل ہو گئی تو مسلمانوں کا بڑا کارنامہ ہوگا اور یہ کہا جائے گا کہ جو کام ایک ریاست موافق حالات میں نہ کر سکی اسکو غریب مسلمانوں نے مخالف حالات میں انجام دیدیا، اسلیے امید ہے کہ مسلمان خصوصاً اصحاب ثروت اس کار خیر میں پوری فیاضی سے حصہ لیں گے۔

~~~~~~~~

افسوس ہے کہ گذشتہ رمضان میں مولوی محمد یحییٰ تنہا مرحوم نے کراچی میں انتقال کیا، مرحوم اردو زبان کے مشہور اہل قلم، اسکے پرانے خدمت گذار اور متعدد کتابوں کے مصنف و مترجم تھے، انکی سب سے مشہور و مفید کتاب سیر المصنفین اور مراۃ الشعرا ہیں، دونوں دو دو جلدوں میں ہیں، سیر المصنفین میں شروع سے لیکر موجودہ دور تک کے مصنفین کے حالات اور انکی تصانیف پر تبصرہ ہے، اس میں اردو کی پوری تاریخ آگئی ہے، مراۃ الشعرا اردو کے شعرا کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

~~~~~~~~

پاکستان میں جن لوگوں کو دار المصنفین کی کتابیں مطلوب ہوں وہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب کشمیری گیٹ لاہور سے طلب کریں، معارف کا چندہ سخی احمد صاحب ہاشمی لکچرار اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کے پاس جمع ہوتا تھا، وہ اس سال حج کو گئے ہیں اسلیے انکی واپسی تک کوئی صاحب ان کے نام چندہ نہ بھیجیں۔

~~~~~~~~

مقالات

ذالک الفوز العظیم

سفرنامۂ حج مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے آج سے چالیس سال پہلے ۱۹۲۶ء میں حج بیت اللہ کیا تھا اور اس کی مختصر روداد بھی قلمبند فرمائی تھی، جو ابتک غیر مطبوعہ تھی، یہ روداد ان کے خلف الصدق اور ہمارے محترم بزرگ جناب عبید الرحمن خانصاحب شروانی کی عنایت سے ہم کو مل گئی ہے، جو تاریخی یادگار بھی ہے، مصنف مرحوم کی تحریری لطافتوں اور اس مقدس سفر کے باطنی کوائف کا مرقع بھی ہے، اور دوسرے فوائد و معلومات پر مشتمل ہے، اس لیے اس تاریخی تبرک کو ناظرین معارف کی ضیافت کے لیے شائع کیا جاتا ہے، مصنف مرحوم نے اس روداد کا نام الفوز العظیم رکھا تھا اس لیے اسی کو قائم رکھا گیا ہے، "م"

بنعمتہ تعالیٰ میرا قصد دو سال سے حج کا مصمم تھا، ایک سال تو یہ ہوا کہ جو رقم اس مبارک سفر کے لیے متعین تھی وہ وقت پر ہاتھ نہ آئی، دوسرے سال امن کا اطمینان نہ تھا، بالآخر فضلِ ربانی سے وہ باسعادت زمانہ آگیا جو حاضری حرمین محترمین کے لیے مقدر تھا، الحمد للہ سفر خیر و خوبی سے ہوا،
~~~~~~~~

رب کریم تعالیٰ شانہٗ حضرت رسول کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل میں قبول فرمالے۔

یہ مختصر یادداشت حالات و واردات کی ہے۔

الاعلام آغاز سفر سے قبل متعدد امور ایسے وقوع پذیر ہوئے جو فال خیر و دال علی الخیر کہے جا سکتے ہیں، میں نشانِ فوز و کامیابی تصور کرکے الاعلام کے عنوان سے درج کرتا ہوں۔

(۱) ۱۰ رجب المرجب (۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء) میں دار الخیر اجمیر میں حاضر ہو کر عرس شریف کے موقع پر دعائے سفر کی گئی اور حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہ العزیز کی روح پُر فتوح سے استمداد، وہاں ایک شب ایک گلی سے میں گزر رہا تھا، ایک گورا چٹا نوجوان میٹھی آواز سے گا رہا تھا "کوئی موٹا آئے گا تو ڈلی کھلوائیگا" میں نے کچھ غور کیا اور آگے بڑھ گیا، انہوں نے بآواز بلند کہا "خواجہ میرا موٹا تو آگیا" یہ آواز دلنواز تھی اور میں نے فال خیر سمجھی۔

(۲) ۱۲ رجب میں علماء کی ایک مجلس کا اہتمام کیا گیا جس نے مسلم یونیورسٹی کے واسطے نصاب دینیات و علوم عربیہ تجویز کیا۔

(۳) ۲۳ شعبان المعظم کو میری پوتی ذاکرہ خاتون سلمہا کا عقیقہ ہوا۔

(۴) ۱۵ شہر مذکور کو چھوٹی لڑکی کے عقد سے مع الخیر فراغ حاصل ہوا، چند ہی روز میں سامان سفر بفضلہ تعالیٰ مہیا ہو گیا۔

(۵) اسی اثنا میں حصن حصین کے مطالعہ کی برکت سے مسجد حبیب گنج میں نوافل اشراق شروع کیے گئے جو الحمد للہ اب تک جاری ہیں۔[1]

(۶) ۲۲ شعبان کو حاضر حیدرآباد ہو گیا، وہاں سرکاری قافلہ حجاج کی روانگی کا انتظام کیا۔

---

[1] بفضلہ تعالیٰ اب بھی جاری ہیں ۲۲ رجب المرجب ۱۳۶۳ھ، اب بھی جاری ہیں، ۲۴ رجب ۱۳۶۴ھ، اب بھی جاری ہیں ۱۳۶۵ھ اب بھی جاری ہیں، جمادی الاخری ۱۳۶۶ھ، بفضلہ تعالیٰ اب بھی جاری ہیں، ربیع الاول ۱۳۶۹ھ

تراویح میں سماعت کلام پاک کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ۲۹ رمضان المبارک کو رخصت حج بلا تنخواہ حاصل کرکے ۳۰ کو حبیب گنج آگیا، حیدرآباد سے روانگی کے وقت عارف یمانی حضرت حبیب عیدروس کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائے خیر کی برکت حاصل کی، بمبئی سے جہازوں کی روانگی کی تاریخیں شیخ حاجی احمد صدیق کھتری صاحب کے ذریعہ موصول ہونے پر ۱۷ شوال المکرم روانگی کے واسطے مقرر کی گئی۔

(۷) قبل روانگی حضرت پیر و مرشد رضی اللہ عنہ کے آستانۂ فیض کاشانہ پر حاضری ضروری تھی، چنانچہ ۱۰ شوال المکرم کو شرف حضور حاصل ہوا، ایک دن رات حاضر رہا، ۱۱ شوال کو بوقت صبح فاتحہ پڑھ کر رخصت ہوا، ابتک قلب پر ایک قبض کی سی کیفیت تھی جس کا خیال تھا، بعد فاتحہ چلا ہی تھا کہ قلب میں ایک کیفیت بسط پیدا ہوئی اور قلب نے وہ لطف محسوس کیا جو بزرگوں کی شفقت خاص سے حاصل ہوتا ہے، آنکھیں پرنم ہو گئیں، دیر تک یہ کیفیت رہی، دل نے سمجھ لیا کہ بڑا لطف و کرم فرمایا ہے۔

دوران حاضری میں مولانا عبد الکریم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ملتجائے دعا کی، دعا فرما کر یہ نصیحت کی کہ "میاں بے تعلق ہو کر جاؤ تو لطف ہے، ورنہ سر ادھر رہا اور دل ادھر تو سفر بے نتیجہ ہوگا" مکرر یہ ارشاد ذہن نشین فرمایا، یہ شعر بار بار پڑھا:

فراغت یافتم از حج و عمرہ — چو احرام سر کوئے تو بستم

۱۲ شوال کو فیض آباد میں مولانا شاہ نیاز احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ پہلی حاضری تھی، کسی نے میرا تعارف کرایا تو فرمایا "پرانے شاہزادے ہیں" استدعا پر غایت شفقت سے دعا فرمائی، دعا میں یہ الفاظ بھی تھے "الٰہی نہایت آرام اور بڑی عزت سے یہ سفر ہو" الحمد للہ دونوں بزرگوں کے ارشاد کارگر ہوئے۔

اسی سفر میں بہ تقریب دعوت برخوردار حاجی غلام محمد خاں خیرآباد میں حاضر ہو کر وہاں کے حضرات

کے آستانۂ مبارک پر فاتحہ پڑھی، اس سفر سے واپس آکر علی گڑھ میں استاذین کرمین مولانا عبدالغنی خاں
اور مولانا لطف اللہ رحمہما اللہ کے مزاروں پر فاتحہ پڑھی۔

(۸) ایام شرکت ریاست میں جن جن شرکا کا کام کیا تھا، ان سے یہ کہکر معافی چاہی کہ از خود
خیانت نہیں کی تاہم اعتراف بشریت ہے، سب نے بطیب خاطر معافی دی، جزاہم اللہ خیرا۔ اسی طرح
رعایا و ملازمین سے معافی چاہی، مطالبے ادا کیے، جو نہ ہوسکے ان کے ادا کرنے کی وصیت برخوردار
عبیدالرحمن خاں سلمہ کو کی۔

(۹) ایک شرف عظیم یہ حاصل ہوا کہ اعلیٰ حضرت نظام نے یہ خدمت سراپا سعادت میرے
سپرد فرمائی کہ مسجد نبویؐ اور روضۂ منورہ کی مرمت اور جانمازوں وغیرہ کی تیاری کا تخمینہ کرکے
پیش کروں، اس خدمت میں امداد کے لیے میں نے مولوی سید عطا حسین صاحب انجینیر کی ہمراہی کی استدعا
کی جو منظور فرمائی گئی۔

سفر | ۱۰ شوال المکرم ۱۳۴۲ھ شنبہ کو بعد نماز عصر حصن حصین کی ادعیۂ ماثورہ پڑھکر حبیب گنج سے
روانہ ہوا، بوقت روانگی جناب استاذی مولانا سید اکبر صاحب کی دعائے خیر کی سعادت حاصل ہوئی،
مولانا سے میں نے عربی شروع کی تھی، کابو خاں ضلع پشاور میں وطن ہے، ترمذی سادات سے
تھے، اور حضرت اخون صاحب سوات کے مرید، اتفاقاً اسی زمانہ سفر میں حبیب گنج تشریف
لے آئے تھے۔

علی گڑھ پہنچکر دو روز حسب فرمایش برادر مکرم نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کی کوٹھی میں
مقیم رہا، اعزہ و احباب نے رخصت کے لیے وہاں کرم فرمایا، محب قدیم منشی احتشام علی صاحب
لکھنؤ سے تشریف لائے، یہ وقت بہت اطمینان و مسرت سے بفضلہ تعالیٰ بسر ہوا، جسے دیکھکر موصوف برادر مکرم
نے فرمایا کہ "حج کو قافلے تو بہت گئے ہیں، مگر جس اطمینان، مسرت اور استقلال سے تم جارہے ہو پہلے نہیں دیکھا۔"

ایک روز مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے دعوت سے مشرف فرمایا، مجمع کثیر تھا، اور کھانے لطیف،
بعد ختم طعام دعائے خیر فرمائی، نیز علی گڑھ کے اسٹیشن پر روانگی کے وقت دعا فرمائی، ۱۹ شوال کو دہلی پہنچا،
حکیم بھورے خاں صاحب نے دوپہر کو دعوت کی اور اپنے یہاں ٹھہرایا، شام کو حضرت خواجہ باقی باللہ
رضی اللہ عنہ کے آستانۂ مبارک پر حاضر ہوکر فاتحہ پڑھی، دعا کی، مغرب کی نماز باجماعت مسجد خانقاہ مظہری
میں ادا کی، بعد نماز حضرات خانقاہ شریف کے مزارات پر حاضر ہوکر فاتحہ پڑھی اور دعا مانگی، وہیں سے
سیدھا اسٹیشن پر آیا اور ایکسپریس سے روانۂ بمبئی ہوا، اسٹیشن پر ایک تصرف حضرت پیر و مرشد قدس سرہ
کا دیکھا، چنانچہ جنابہ ہمشیرہ صاحبہ اپنی پیرانی بی کے پاس خانقاہ شریف میں ٹھہری تھیں، ان کے
اسٹیشن پر پہنچنے میں اسقدر تاخیر ہوئی کہ تردد ہوا، کل قافلہ مع سامان کے ریل میں بیٹھ چکا، نہ پائے رفتن
نہ روئے ماندن، حکیم بھورے خاں صاحب کی فرمایش سے دو منٹ ریل روکی گئی، اب بھی انتظار
تھا، اسی اضطراب میں حضرت پیر و مرشد کی جانب میں نے توجہ کی، آنکھیں کھولیں تو پالکی پاس کھڑی
تھی، ہمشیرہ صاحبہ بھی بہ اطمینان سوار ہوگئیں، اب ریل روانہ ہوئی، دہلی میں ریل کے انتظام
میں مولوی سید بہاء الدین صاحب رئیس دہلی نے بہت ہمدردی فرمائی، جزاہ اللہ تعالیٰ عنی خیرا۔
اثنائے راہ میں بھوپال کے اسٹیشن پر تین عالی قدر مخدوم زادوں کی زیارت و ضیافت سے مشرف ہوا،
مولوی حافظ محمد عنایت اللہ خلف الصدق حضرت مولانا لطف اللہ، حکیم حاجی عبدالقادر خاں صاحب
خلف رشید حضرت شاہ عبدالغفور خاں صاحبؒ مجددی نقشبندی، شاہجہانپوری اور شیخ
عبداللہ میاں خلف الصدق حضرت شیخ حسین محدث یمنی، رحمہم اللہ تعالیٰ، ہاردہ کے اسٹیشن پر عزیز
عبدالحمید خاں نے سہ پہر کی چائے کی ضیافت کی، ۱۲ شوال کی صبح کو قافلہ مع الخیر بمبئی پہنچا،
نفیس وطن حیدرآباد سے آگئیں، سب مل کر شیران کاٹیج بنگلے میں مقیم ہوئے، یہ بنگلہ موتی بائی
اسٹریٹ میں کلب روڈ پر شیخ الفضل کے بنگلے کے قریب واقع ہے، دو منزلہ صاف ستھرا آرام کا

مکان تھا، شیخ احمد صدیق کھتری نے جملہ انتظام بمبئی میں عمدہ اسلوب اور غایت عنایت سے کیے جزاہ اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء، صاحب مکان حاجی جعفر بھائی بیرسٹر نے بے کرایہ قیام کی اجازت فرمائی، سامان ضروری کرایہ پر لیا گیا، بیرسٹر صاحب کا شکر عنایت ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ادا کیا، شیخ الفضل بمبئی کے معزز تاجر ہیں، نمازی کمپنی کے ایجنٹ ہیں جو حجاج کو لیجاتی ہے، ابن سعود کے بھی ایجنٹ ہیں، کھتری صاحب نے ان کے ذریعہ سے جہاز کا اور حجاز کا انتظام کیا، جس سے بہت کچھ آرام ملا، آسانی حاصل ہوئی، بارہ روز بمبئی میں قیام رہا، موسم خوشگوار، آموں کی بہار، رحمت کا ظہور، نعمت کا وفور، بلدۃ طیبۃ و رب غفور، حیدرآباد کا قافلہ حجاج بھی آیا ہوا تھا، اختر یار جنگ بھی تھے، وقت بہت اچھا گذرا، شیخ الفضل نے مہربانی سے دعوت بھی کی،

بالآخر سمندر کا سفر شروع ہوا ع دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرساہا،
۱۴ ذیقعدہ روز دوشنبہ کو سہ پہر کے وقت نمازی کمپنی کے جہاز "گرجستان" نامی پر مع الخیر سوار ہوئے، خیران کا کنج میں قیام رہا، گرجستان میں سفر ہوا، جمال و جلال دونوں کے مظاہر گویا ضم تھے، جہاز میں بہترین سیلون اور کمرے قیام کے لیے ملے، انتظام اور صفائی بہت اچھی تھی، کپتان خلیق اور معقول تھا، حجاج کی آسایش و رعایت کا پورا خیال رکھتا، ساتھ ہی ضبط و آئین کا بھی،

جہاز پر سوار ہوتے ہی تین شوق بالکل فنا ہوگئے، اخبار بینی، شعر گوئی اور پان خوری، چند روز قبل سے اردو شعر کہنے کا ذوق از خود پیدا ہو گیا تھا، بے اختیار شعر موزوں ہوتے، کبھی کبھی ایک وقت دو دو غزلیں موزوں ہوتی رہتیں، جو طرح پسند آجاتی غزل پوری ہو جاتی، سمندر میں پہنچ کر گویا یہ سوتا خشک ہو گیا، اخبار واپسی بمبئی تک دیکھا ہی نہیں اور نہ دل چاہا، حالانکہ بہ سہولت التزام و اہتمام تھا، جو مسافر جہاز کے فرسٹ کلاس میں تھے ان میں "موتمر"

اور سیاسیات پر بحث کا بہت ہنگامہ تھا، جو اکثر اوقات برپا رہتا، میری طبیعت بحمد اللہ بالکل اس سے بیگانہ رہی، ایک بار سے زیادہ مجھ سے شرکت "موتمر" کی بابت سوال ہوا اور ہر دفعہ میں نے انکار کیا، میرا وقت زیادہ تر مسائل حج دیکھنے اور ادعیۂ حج یاد کرنے میں گذرا، مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے ازراہ کرم ایک رسالہ مسائل حج پر لکھ کر توشۂ سفر ساتھ کر دیا تھا، وہ برابر دیکھا، اس سے ادعیہ ایک جگہ لکھ کر یاد کیں، تاریخ حرمین شریفین الاعلام اور سفرنامۂ خدیو مصر عباس حلمی پاشا بھی ساتھ تھا مگر ان کے پڑھنے کو بھی دل نہیں چاہا، الحمد للہ بہت کچھ یکسوئی رہی، جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب حضرت شیخ دہلوی رحمہ اللہ کا مطالعہ البتہ کیا، اس کا انتخاب سفر مدینہ طیبہ کے لیے ملتوی رکھا،

جہاز نے براہ کراچی سفر کیا تھا، ۱۶ ذیقعدہ گزار کر ۹ بجے شب کو کراچی پہنچے، الفضل کے ایجنٹ جہاز تشریف لائے، کراچی میں اترنے کی دعوت دی، صبح کو کراچی گئے، دوپہر کا کھانا موصوف ایجنٹ کے یہاں کھایا، اسی روز پانچ بجے شام کو جہاز کراچی سے روانہ ہوا، کراچی سے روانہ ہونے پر اثنائے راہ میں ایک واقعہ پیش آیا، کراچی سے ایک گروہ غیر مقلدوں کا جہاز پر سوار ہوا، اسی روز شام کو نماز مغرب کی جماعت کا انتظام انھوں نے کیا، میں بھی شریک جماعت کے خیال سے ہو گیا، اس کے بعد بارش اور ہوا کا سلسلہ شروع ہوا، عشاء کی نماز انھوں نے جماعت سے میرے کمرے میں آکر پڑھی، اس طرح اتفاقاً پھر شرکت جماعت ہو گئی، اس کا اثر قلب پر صبح کو سخت ہوا، انقباض کی کیفیت سے میں گھبرا گیا، جذب القلوب کے مطالعہ سے قلب میں رقت پیدا ہوئی اور اس کے اثر سے یہ کیفیت رفع ہوئی، پھر نماز ان کے ساتھ نہیں پڑھی،

چونکہ اس راستے میں عدن نہیں آتا اس لیے سب سے پہلے مبارک سرزمین عرب کا حصہ

بیرم جزیرہ دیکھا، کپتان نے پہلے سے اس کے آنے کی خبر دیدی تھی، اس لیے انتظار تھا جس وقت وہ پاک سرزمین نظر آئی نگاہ محبت و عقیدت سے دیکھی، قلب میں رقت پیدا ہوئی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، گنہگاری یاد آئی، دیر تک دعا و استغفار کا سلسلہ عجز و نیاز کے ساتھ جاری رہا، سرزمین مقدس عرب کی یہ پُرتزکیہ تاثیر ہر ہر مقام پر دیکھی۔

دوشنبہ ۱۸ ذیقعدہ کو ۹ بجے صبح جہاز بندرگاہ جدہ میں داخل ہوا ؎

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید زورقِ امید بہ ساحل رسید

جدہ کے حمالوں کی دراز دستی اور جھگڑک کی دقتوں کا اندیشہ بہت کچھ دلایا گیا تھا، اس لیے خیال تھا، اس کی بندہ نوازی، جہاز کے پہنچنے کے بعد ہی شیخ علی رضا زینل قائم مقام جدہ، رئیس البلدیہ جدہ (میونسپلٹی) اور مدیر اخبار ام القریٰ اور ایک صاحب ممبر سیلون میں تشریف لائے، ملک الحجاز ابن سعود کی جانب سے خیر مقدم کیا، اور موٹر کشتی میں ہم سب کو سوار کر کے جدہ بہ آرام پہنچا دیا، قیام کے لیے قصر شریف علی تجویز ہو چکا تھا، یہ ایک شاندار عمارت سمندر کے کنارے پر ہے، جو شریفیہ عہد میں دار الامارۃ تھی، تھوڑی دیر میں بقیہ ہمراہی اور سامان بھی وہاں پہنچ گیا جس دقت کا اندیشہ تھا، وہ بفضلہ تعالیٰ خواب میں بھی نظر نہ آئی اس دن اور شب کو جدہ میں قیام رہا، ضیافت بھی ابن سعود کی جانب سے تھی، سہ پہر کے وقت قائم مقام جدہ کے مشورہ کے بموجب ملک الحجاز کو اپنے جدہ پہنچنے کی اطلاع تار کے ذریعہ سے کی، اور اخلاقاً حاضری کی اجازت طلب کی، جواب میں پُرعنایت خیر مقدم کا پیام آیا، شام کو انگریزی کونسل سے ملاقات کی۔

۱۹ ذیقعدہ سہ شنبہ کو دوپہر کے قریب تین موٹر لاریوں پر (جو حکومت کی جانب سے مہیا کی گئی تھیں) ہمارا قافلہ روانہ مکہ مکرمہ ہوا، جناب عم محترم مولوی حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب مرحوم

کی روح کو اماحوا کے قریب پہنچکر ثواب فاتحہ بخشا، جناب ممدوح یہیں بعد سفر حج و زیارت مدفون ہوئے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ راستے میں سخت تپش تھی، پاؤں کو اس قدر حدت محسوس ہوتی تھی گویا چولھے کے پاس رکھے ہیں، بایں ہمہ لطف نہانی جاں نواز تھا، قلب فرحت سے باغ باغ ہو رہا تھا ؎

آگ میں ہوں پہ باغ باغ ہوں میں ہوں میں گل چینِ گلستانِ خلیل (درد)

ایک بار سے زیادہ اس دوران میں رقت آمیز دعا و استغفار کی نوبت آئی خصوصاً حد حرم میں داخل ہونے کے وقت بمقام جدہ پورا جوش نیاز و عجز تھا، پیہم دعا و استغفار تھے، اشک رواں تھے، مکہ مکرمہ زادہا اللہ تعالیٰ تشریفاً کے قریب پہنچکر سات کبوتر نظر آئے، الحمد للہ حرم شریف میں سات جھیے ادا ہوئے۔ لاری کے قائد نے اشارہ کر کے کہا "ہذا حمام الحمی" عاجز دل نے محسوس کیا کہ مسافر نوازی فرمائی گئی، اس تصور سے دیر تک ایک کیف رہا، دعاؤں کے ورد کے ساتھ عصر کے وقت لاریاں مکہ مکرمہ پہنچیں اور ایک عمر کی تمنا بلکہ حاصل زندگی تمنا فضل ربانی سے برآئی، زیارت بیت اللہ المکرم و حاضری مسجد الحرام کا شرف حاصل ہوا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، ظہر (قضا) اور عصر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کی، طواف عمرہ و سعی صفا و مروہ سے مشرف ہو کر احرام اتارا، پیاس تھی، برف کی بالائی اور تازہ خوبانی ذائقہ نواز و سرمایۂ تسکین ہوئی۔ الحمد للہ تعالیٰ۔ قیام و ضیافت کا اہتمام منجانب حکومت حجاز تھا، حرم شریف سے بالکل متصل "بیت خوفیر" میں قیام ہوا، یہ مکان باب الدُّریبہ کے قریب اور کتابخانۂ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے آمنے سامنے ہے، عالیشان کئی منزل کی عمارت ہے، سلطان سلیمان خان اعظم نے چاروں مذاہب کی فقہ کی تعلیم کے لیے مدرسہ بنوایا تھا، مرور زمانہ سے شخصی ملک ہو گیا، حافظ وہبہ مصری مشیر حکومت مع ہمراہیان ملاقات و تبریک کے لیے تشریف لائے، شکایت کی کہ آمد کی اطلاع نہ دی گئی اس لیے وقت پر خیر مقدم نہ ہو سکا، جس کا پہلے سے انتظام تھا،

مولوی ندیم احمد صاحب مجددی سے حرم محترم کے دروازہ پر عین حاضری کے وقت ملاقات ہوگئی تھی، دوسرے روز مقامی اخبار ام القریٰ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ میں قاضی القضاۃ حیدرآباد کی حیثیت سے مندوب ہوکر شرکتِ مؤتمر کے واسطے آیا ہوں، میں نے اول موقعہ پر اہل حکومت سے اس کی زبانی تردید کردی، کہدیا نہ میں قاضی القضاۃ ہوں اور نہ مندوب، مؤتمر میں شرکت بھی نہیں کروں گا، محض حج کی نیت سے ذاتی طور پر حاضر ہوا ہوں، جب وجہ عدم شرکت بار بار دریافت کی گئی تو بالآخر میں نے تجربے کی بنیاد پر کہا کہ ایسی مجالس سے سوائے بحث و مباحثہ کے کسی عملی نتیجے کی امید بیجا ہے، لہذا میں نیت حج میں کسی اور کام کی شرکت پسند نہیں کرتا،

۲۲ ذیقعدہ کی شب کو بعد عشا، ابن سعود سے سقافیہ میں ملاقات ہوئی، حافظ وہبہ مصری اگر حکومت کے موٹر میں لے گئے، سلطان اُس وقت حدیث شریف سن رہے تھے، مجھ کو باصرار اپنے قریب بے تکلف بٹھایا، حدیث شریف کے سماع سے فارغ ہوکر گفتگو کی، ملاقات تو تقریباً ۴۵ منٹ تک رہی مگر باتیں کم ہوئیں، زیادہ حصہ سکوت میں گذرا، دو مرتبہ میں نے اجازت بھی چاہی، مزید نشست پر اصرار کیا، خیر مقدم کے بعد راستے کی خیریت دریافت کی، آسائشِ قیام کا حال پوچھا، مدینہ طیبہ کے راستے میں موٹر چلنے پر خیالات ظاہر کیے، کہا ابھی محطات نہیں جہاں سامان مزدوری دستیاب ہو، اس لیے تاخیر ہے، عنقریب چلنے لگیں گی، حیدرآباد کی آبادی اور پیداوار پر گفتگو کی، ایک موقعہ پر میرے استفسار پر حافظ وہبہ نے (بتایا) کہ سلطان نے ملاقات کے بعد تمھاری نسبت کہا ھُوَ رَجُلٌ اَصِیْلٌ۔

۲۵ ذیقعدہ کو مؤتمر الاسلام کا اجلاس ہوا، افتتاح خود ابن سعود نے باضابطہ جلوس کے ساتھ کیا، ایک روز قبل سامع کا ٹکٹ بھیج کر مجھ سے بھی صرف جلسۂ افتتاح کی شرکت کی فرمائش کی تھی، چنانچہ میں بھی شریک ہوا، افتتاح کے بعد چلا آیا، پھر شریک نہ ہوا، جلسے کا رنگ

دیکھ لینے کے بعد اہل الرائے نے میری رائے کی تحسین کی، ایک روز مدرسۂ صولتیہ بھی دیکھا، مدرسہ تو بند تھا، عمارت دیکھی نیز کتب خانہ، عمارت اگرچہ ناتمام ہے تاہم بہت کچھ بن چکی ہے، مسجد کی عمارت شمالی ہند کے مساجد کے نقشے کے مطابق ہے، مولوی محمد سعید صاحب مہاجر کا اہتمام و تدبر قابل صاد ہے،

۸ ذی حجہ سے قبل منیٰ میں جاکر مکان پسند کیا، اثنائے راہ میں جبل النور مطوف صاحب نے دکھایا، ایک سیدھی بلند چٹان دیدہ افروز تھی جس کا رنگ اُداہٹ لیے محسوس ہوا، اس مبارک چٹان سے گویا نگاہ لپٹ گئی، جب تک سامنا رہا دیکھتا رہا، نظر جم جانے کے بعد بداہتہً ایک اثر اس پہاڑ کے آسمانی بلکہ عرشی تعلق کا قلب محسوس کرتا رہا جس قدر احساس قوی ہوتا گیا قلب پر ایک کیفیت بیخودی و وجد بڑھتی گئی، یہ اس امر کی شہادت ہوگی کہ نزولِ وحی کے برکات و آثار اس بقعۂ مبارکہ پر فیض بار ہیں۔ ع ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست۔

۲ ذی حجہ کو جلسۂ امداد تعمیر نہر زبیدہ خاتون میں ابن سعود سے مکرر ملاقات ہوئی، ایک ہزار (۱۰۰۰) روپیہ چندہ دیا گیا،

۸ ذی حجہ کو حطیم میں احرام باندھا اور منیٰ کو روانگی ہوئی، مکان آرام کا ملا، صاف، وسیع، ہوادار، متعدد قطعے تھے، مغرب کی نماز مسجد خیف میں ادا کی، شب کو مصریوں اور نجدیوں سے تصادم کا واقعہ پیش آیا، ہمارے مکان تک چند آوازیں فیر کی سنی آئیں، بدوؤں میں اضطراب ہوا، مع اونٹوں کے بھاگنا چاہا، حوشے (احاطے) کا دروازہ بند کردیا گیا، دوسرے روز عرفات کے راستے میں ایک اونٹ گولی کے زخم سے مرا ہوا دیکھا، اس سے زیادہ واقعے کا کچھ اثر ہم کو محسوس نہیں ہوا۔

۹ ذی حجہ کو عرفات میں دوپہر کے قریب حاضری ہوئی، ایک موقعہ پر جبل رحمت کے قریب

خیمے نصب ہو گئے، آرام سے ٹھہر گئے، گرمی تیز تھی، پانی وافر تھا، سقے بار بار لاتے، ضرورت نہ ہونے کے سبب انکار کر دیا جاتا، دوپہر کے کھانے کے بعد تفاؤل خیر ہوا، بمبئی کے آموں میں سے ایک آدھ آم بچ رہا تھا، حاجی محبوب خادم نے لاکر دیا، میں نے باریک باریک قاشیں کرکے ایک خود کھائی، باقی رفقا کو کھلائیں، شکر نعمت ادا کیا، ظہر کی نماز مسجد نمرہ میں ادا ہوئی، سلطان یا نائب سلطان امام نہ تھے، اس لیے صرف ظہر کی نماز جماعت سے ادا کی، اس کے بعد خیمے میں آکر تلاوت کلام مجید کی، راستے میں ریت اس قدر تپ رہی تھی کہ دلی کے جوتے کے اندر پاؤں سوزش محسوس کرتے تھے، خیمے سے مسجد کا اندازاً ایک میل کا فاصلہ ہوگا، تاہم دل اس قدر محظوظ تھا کہ فرحت کا ایک جوش سینے میں محسوس ہوتا تھا، مسجد میں جس وقت پہنچا تو نمازیوں سے معمور تھی، صحن میں دھوپ میں بیٹھنے کا قصد کیا، اندر سے ایک صاحب نے نام لیکر اندر بلایا، میں نہ گیا تو اصرار کرکے بلالیا، صف اول میں جگہ بہ آسائش مل گئی، بلانے والے صاحب ہندوستانی معلوم ہوتے تھے، مگر میں باوجود غور کے پہچان نہ سکا، جزاہ اللہ تعالیٰ عنی خیرا۔

اذا جاء احدکم فاوسع له اخوه فانما هی کرامة اکرمه الله بها۔ (خ۔ ہب۔ الجامع الصغیر)

نماز عصر خیمے میں ادا کی، اس کے بعد جبل رحمت کی حاضری سے مشرف ہوا، میرے ہمنام مولوی لدھیانوی ساتھ لے گئے، مقام ناقہ نبوی قصواء نامی کے قریب حاضر ہو کر دعا شروع کی، ہاتھ اٹھنے کے بعد دعا کے الفاظ زبان پر آئے تھے کہ قلب میں ایک جوش خضوع پیدا ہوا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق۔ بدن جھک گیا، معاصی کی یاد اور ندامت دل و جسم کو گھلائے دیتے تھے، گھلاوٹ آنسو بنکر آنکھوں سے رواں تھے، اسی عالم میں دیر تک استغفار و دعا کا سلسلہ جاری رہا، الحمد للہ خضوع و خشوع کا وہ عالم طاری ہوا جو مدۃ العمر کبھی نہ دیکھا تھا۔ آنسوؤں سے نہ صرف چہرہ اور داڑھی تر ہوئی بلکہ

ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی تر بتر ہو گئیں، قال اللہ تعالیٰ

تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق

یہ بین دلیل جوش رحمت کی تھی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، ختم دعا کے بعد قلب نے راحت سکون محسوس کی جو بنعمتہ تعالیٰ دلیل قبول دعا ہوگی، مغرب کا وقت اچھی طرح ہو جانے پر عرفات سے مراجعت ہوئی، روانگی کے وقت چادر شب نے اس وسیع اور متبرک و مقدس میدان کو چھپا لیا تھا، ہزاروں انسان اور اونٹ اس اندھیرے میں رواں تھے، اس وقت مجھکو ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا، قلب نے محسوس کیا کہ جس قدر میدان انسانوں سے خالی ہوتا جاتا ہے، آسمان سے نازل ہونے والے ملائکہ سے بھرتا جاتا ہے[1]، یہ احساس دم بدم قوت پکڑتا گیا، آنکھیں تو نہ دیکھتی تھیں، باقی تمام کیفیت اُس قدسی گروہ کے نزول و اجتماع کی قلب محسوس کرتا تھا، یعنی قلب کو احساس قرب عظمت و تقدیس کا تھا، دیر تک اور دور تک یہ کیفیت طاری رہی، مزدلفہ پہنچکر نماز مغرب و عشاء ملا کر پڑھی، رمی جمار کے لیے کنکریاں چنیں، اونٹوں کے حلقے میں زمین پر بستر جمائے گئے، تہامہ کی رات کا سماں دیکھا، اُس شب کی خنکی و راحت اور خواب راحت ساری عمر یاد رہے گی ؎

سقی اللہ لیلاً کصدغ الکواعب — شبے عنبریں موئے و مشکیں ذوائب

ظاہراً ایک عالم تھا جو عالم سفلی کی کیفیات سے بالاتر تھا، سونے میں سہاگا، چاندنی نے سرور کو پُرنور کر دیا تھا، یارب کریم وہ پُرنور سرور پھر نصیب حبیب فرما، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

منیٰ واپس آکر قربانی کی، رمی جمار سے باطمینان فراغت حاصل ہوئی، شب دوازدہم کو

[1] مشاہد الحج۔ وہی مواطن الشریفۃ التی یحضرون الملائکۃ والابرار من الناس (المفردات امام راغب)

منیٰ میں صبح کے قریب میں نے خواب میں دیکھا کوئی کہتا ہے "یوجِ عم کا ہے" میں نے پوچھا کیا مطلب، کہا
ان کا جو بے تعلق رہے" مولانا عبدالکریم صاحب مراد آبادی کا مقولہ یاد کرو، اللہ پاک اپنے حبیب کریم
علیہ افضل التحیۃ والتسلیم کے صدقے میں اس زمرے میں مجھ عاجز گنہگار بندے کو بھی داخل فرمائے
نیز میرے ساتھیوں اور دوسرے مسلمانوں کو،

۱۲ ذی حجہ کی شام کو حرم شریف میں پہنچکر طواف زیارت سے مشرف ہوا،

۱۳ ذی حجہ کی شب کو ایک اور خواب دیکھا، بوقت صبح ایک میدان میں مکہ مکرمہ کے
باہر کھڑا ہوا ایک مسلک فی الدین کو سمجھا رہا ہوں، اسی میدان میں کچھ فقرا بڑے بڑے بال والے
کالے رنگ کے اوپر کا جسم برہنہ، اپنا اپنا فقیرانہ سامان لیے بیٹھے ہیں، تھوڑی دیر میں بڑے بڑے
پرندے قاز اور بطوں کے برابر کثرت سے اڑتے نظر آئے جس مسلک کو میں سمجھا رہا تھا، اسکو
یہ پرندے دکھلانے لگا، وہ پرندے قریب آئے تو معلوم ہوا بڑے بڑے کبوتر ہیں، اسی عرصے میں
ان فقرا نے بھی اڑنا شروع کیا، بڑی قوت اور جوش سے، بال سب کے ہوا میں اڑتے تھے، ایک دو
ان میں ایسے بھی تھے جو دوسرے کے کندھے پر سوار اڑ رہے تھے، ہاتھ میں دوربین تھی جس سے آسمان کی
طرف دیکھتے جاتے تھے، میں ان فقرا کو کھڑا دیکھتا رہا اور مسلک کو سمجھاتا رہا،

منیٰ میں سوء ہضم کی شکایت ہو گئی، مکہ مکرمہ پہنچکر بڑھ گئی، تاہم نیچے اترنا، حاضر حرم محترم
ہونا جاری رہا، مکہ مکرمہ حاضر ہونے پر حج سے قبل قاری عبدالرحیم صاحب کو (جو مصر اور قراء کے
دور سابق کی یادگار اور قاری عبدالخالق صاحب مرحوم کے بھائی ہیں) قرآن شریف سنانا شروع
کر دیا تھا، الحمد للہ یہ سنانا ۲۰ ذی حجہ کو ختم ہوا، قاری صاحب نے فاتحہ ختم پڑھی، اسی عرصے میں الشیخ
حبیب اللہ الشنقیطی سے حدیث مصافحہ و مشابکہ کی، نیز دیگر مرویات کی سند حرم شریف میں حاصل ہونے
کی سعادت نصیب ہوئی، شیخ ابو شرف صاحب مجددی سے متعدد بار ملاقات ہوئی، موصوف

نے ایک روز دعوت ناشتہ بھی کی۔

"اخوان" کی زیادتیوں کی خبریں سن کر مکہ مکرمہ کے مشاہد مقدسہ میں حاضر ہونے کا قصد نہیں کیا،
جبل ابو قبیس کی زیارت البتہ مکان میں سے ہوتی رہتی تھی، یہ مقدس پہاڑ مکان کے بالکل سامنے تھا، آخر ذی حجہ
کے بعد پیچش کی زیادتی ہو گئی، نیچے اترنا بالکل موقوف ہو گیا، حکیم تفضل حسین خاں صاحب رامپوری نے
نہایت عنایت و ہمدردی سے علاج فرمایا، دو مرتبہ روزانہ صبح و شام آتے، بعد عشاء مزاج پرسی فرما لیتے،
جزاہ اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء، آخر آخر میں پیچش میں شدت ہو گئی تھی، دن رات میں کم و بیش ۵۰ اسہال
آ جاتے تھے، تاہم بفضلہ تعالیٰ نماز صبح و مغرب جماعت سے ادا ہو جاتی، نیز جمعہ کی، بیت اللہ الحرام
سامنے تھا جس وقت جماعت شروع ہوتی میں بھی اقتدا کر لیتا، ان نمازوں کے سوا یہ حالت تھی
کہ نماز عشاء دو دو تیمموں سے ادا کی جاتی تھی، سدے خارج نہ ہوتے تھے، اس لیے مسہل کی
ضرورت معالج نے محسوس کی، علالت کے زمانے میں مولانا الحاج شفیع الدین صاحب (خلیفہ
حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ) نے متعدد بار کرم فرما کر مزاج پرسی کی، ایک بار اس وقت
تشریف لائے جب مسہل تجویز ہو چکا تھا، فرمایا آب زمزم شریف بہ نیت اسہال پیو، پیا، مسہل
کامیاب ہوا، سدے خارج ہو گئے، اب حابسات کا استعمال شروع ہوا، ان دنوں میں تشریف
لائے تو فرمایا، اب حبس کی نیت سے زمزم شریف پیو، پیا، نفع عاجل حاصل ہوا،

دوران علالت میں جس سلیقے، ترتیب، دلسوزی اور استقلال سے دردانہ نے تیمارداری کی،
وہ مدۃ العمر یاد رہے گی، اسی زمانے میں اسماء خاتون ان کی بھانجی بھی علیل ہو گئی تھی، بخار سخت تھا،
جس سے تردد تھا، تاہم ان کے استقلال میں ذرا بھی فرق نہ تھا، اہتمام علاج و تیمارداری اس سے
ظاہر ہوگا کہ ہر اجابت کے بعد صاف طشت بدل دیا جاتا تھا، جزاہا اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء، خفت مرض
کے بعد ارادہ ہوا کہ چندے طائف میں تبدیل آب و ہوا کی جائے، قوت آنے پر مدینہ طیبہ کا سفر مبارک ہو

اس ارادے کی اطلاع ابن سعود کو ہوئی تو براہ عنایت وہاں قیام کا انتظام کرکے مجھ سے کہلا بھیجا، ما
کہ تبدیلِ آب و ہوا مناسب ہے، فلاں مکان تجویز کر دیا گیا ہے، پانی فلاں کنوئیں کا استعمال کیا جائے، جب یہ
یہ سب کچھ ہو گیا تو قلب کو اس تصور سے وحشت ہوئی کہ مدینہ طیبہ کی حاضری میں مزید تاخیر ہوگی، اور نے
ایک دوسرا سفر حائل قصد ہوتا ہے، اس خیال کے آنے پر طائف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا،
اور ابن سعود کو اطلاع کر دی، اب مدینہ طیبہ کے سفر کی تیاریاں بفضلہ تعالیٰ شروع ہوئیں، قافلے
تمام روانہ ہو چکے تھے، ۲۲ ذی حجہ سے روانگی شروع ہو چکی تھی، حرم شریف میں ازدحام حجاج کا رہا نہ ہے
تھا، مدینہ طیبہ کے مبارک سفر سے پہلے بیت اللہ شریف میں داخلی ضروری تھی، پیچش کی زیادتی ہونے لے
سے پہلے شیبی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو لیا تھا، ۱۴ محرم الحرام ۱۳۴۵ھ پنجشنبہ روانگی مدینہ طیبہ
کے واسطے مقرر ہوئی، شب پنجشنبہ کو شیبی صاحب نے داخلی کا انتظام کر دیا، داخلی کا وقت بعد نماز عشا لو
قرار پایا، قافلوں کے چلے جانے کی وجہ سے پورا سکون و سکوت اُس موقعہ پر تھا، شدتِ علالت کے ب
جو پہلی بار کرسی پر بیٹھ کر اس موقعہ پر پہنچے آیا، جوں جوں وقتِ حاضری قریب آتا جاتا تھا، دل پر ہیبت ط
بڑھتی جاتی تھی، عمامہ باندھنے کے وقت اپنی بداعمالی و گنہگاری یاد کرکے بار بار اندیشہ ہوا کہ کہیں داخلے لی
کے وقت صورت مسخ نہ ہو جائے، فضل و کرم کے سہارے نے دل تھاما، خلاصہ شرف داخلی
و بار یابی سے مشرف ہو، فللہ الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، شیبی صاحب کے بڑے صاحبزادے دروازہ م
کے قریب اندر بیٹھے تھے، ایک سہ شاخہ اندر روشن تھا، داخلی کے وقت سخت گرمی محسوس ہوئی،
نگاہ نیچی کیے ہوئے ادب سے عاجز از سیدھا آگے بڑھا، داخلی کی دعا زبان پر برابر جاری تھی، سامنے کی ع
دیوار کے قریب پہنچکر دو رکعت نماز پڑھی یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہ
نے نماز ادا فرمائی تھی۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، بعد نماز دیر تک اہتمام خضوع کیا تھا
دعا کی۔ استغفار میں زیادہ حصہ گزرا اور دعائیں بھی کیں، جن پر حضور نظام کے جاہ و اقبال کی بھی تھی،

دفعۃً نسیم لطف کا ایک جھونکا آیا، جس نے قلب میں ایک زبردست انبساط اور وجد کی کیفیت
پیدا کر دی، اس کیف نے گویا کایا پلٹ دی، اب اور ہی عالم تھا، دعا میں اور ہی ذوق تھا،
اسی عالمِ کیف میں ایک دعا کے مرتب الفاظ قلب پر گویا القا ہوئے، القا یوں مانتا ہوں کہ
نہ ان الفاظ کی طرف میرا خیال تھا اور نہ کبھی ان الفاظ یا ان کے مشابہ الفاظ میں مدۃ العمر
دعا کی، نیز یہ کہ ان الفاظ کے ذہن میں آتے ہی انبساط و وجد سابق میں ایک جوش مواجی
پیدا ہو گیا، ہاتھ بے اختیار اپنی پوری وسعت کی حد تک پھیل گئے، جو مبارک و باعظمت دیوار
سے دور نہ رہے ہوں گے، خلاصہ خضوع و ذوق کا پورا نقشہ کھنچ گیا، مبارک دعا یہ تھی:
"یا کریم ان ہاتھوں کو مرادوں سے بھر دے"۔ کونسی عبارت یا زبان اُس عالم کیف و وجد کا ایک
شمہ بھی بیان کر سکتی ہے، جو اس دعا کے وقت قلب و روح پر طاری تھا، یہ عاجز بندہ گویا مجسم
ذوقِ عبودیت ہو کر یہ الفاظ ادا کر رہا تھا، اور گویا ظاہر و باطن دونوں مل کر زبانِ دعا بن گئے
تھے، سوائے محویت دعا کے نہ کوئی تصور تھا اور نہ کوئی احساس، شروع میں کبھی لفظ مبارک
"یا کریم" زبان پر آتا اور کبھی "یا مولیٰ"۔ جوشِ عبودیت تھا اور ان قدسی اثر الفاظ کی تکرار۔
تکرار تھی اور جوشِ کیف، مزید کرم فرمایا گیا، جوشِ کیف نے لذتِ حضور حاصل کی، ادراک ہونے لگا،
کہ مولائے کریم قریب ہی سن رہا ہے، اور نہ صرف سن رہا ہے بلکہ اندازِ دعا سے خوش بھی ہو رہا ہے،
اس ادراک نے کیفِ عبودیت کو اور تیز کیا، اللہ پاک بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر یہ عالم رہا،
کیا یہ عاجز بندہ اس کو مژدۂ رضا تصور کر سکتا ہے، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔
ثم الحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ بالآخر جوش، کیف، سکون راحت سے مبدل ہوا۔

لہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من فتح لہ من الدعاء منکم فتحت لہ ابواب الاجابۃ

(المصنف لابی بکر بن ابی شیبۃ، کتاب الدعاء، باب فی فضل الدعاء)

اور جو عاجز گنہگار بندہ مسخِ صورت کا اندیشہ لیکر حاضر ہوا تھا، وہ لطف وکرم سے نوازتہ
دل لیکر رخصت ہوا ۔

اے خدا قربانِ احسانت شوم
ایں چہ احسان ست قربانت شوم

الحمد للہ، ان نقوش کی تحریر کے وقت بھی قلب نے کیفِ رحمت کا احساس
کیا، آنکھوں نے اشک بہائے۔ فالحمد للہ تعالیٰ۔ ع

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان ست

قال الشیخ العارف باللہ الامام ابو القاسم القشیری بل اللہ ثری قدس سرہ العزیز
البسط سرور وارتیاح یرد علی القلب فینفی الضیق والوحشۃ۔
ثم موجبات البسط تختلف فمرۃ یکون باقبال ومرۃ بتقریب ومرۃ
یکون بلطف وبر۔ ومرۃ بانجاز وعد ومرۃ دون محتضر من
الافضال وشئ من لطیف النوال۔ الیٰ غیر ذلک من اقسامہ مما
لایاتی الحصر علی استیفاء احکامہ (عیون الاجوبۃ فی فنون الاسئلۃ)

وقال ایضاً رحمہ اللہ تعالیٰ

اذا کان العبد فی محل ...... التقریب جعل اللہ غالبہ البسط۔
واذا کان مراداً فغالب احوالہ البسط۔ واذا اشہدہ الحق عیوب
نفسہ فغالبہ القبض واذا اشہدہ کرم قدسہ فغالبہ البسط۔
واذا ادھشہ لکثرۃ افضالہ فغالبہ البسط واذا احیاہ بعاجل
برہ فغالب وقتہ البسط" (عیون الاجوبۃ)

دوسرے روز شام کو ارادۂ سفر مبارک تھا، مگر اہتمام کی بعض بے عنوانیوں کی وجہ سے روانگی
نہ ہوسکی، جمعہ کی شام کو ہوئی، بے عنوانی، عنوان خیر ہوگئی، وہ حرم محترم تھا جہاں مرادیں ملتی ہیں،
خطائیں صواب بن جاتی ہیں، روانگی بجائے شام پنجشنبہ کے جمعہ کی شام کو ہوئی، اس طرح ایک
نماز جمعہ اور حرم محترم میں ادا ہوگئی، جملہ سات جمعے ادا ہوئے۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔
مکہ مکرمہ میں منیٰ اور عرفات ملاکر) ۴۵ دن حاضر رہا، پانچ دن منیٰ اور عرفات میں پورے چالیس
دن مکہ مکرمہ جوار بیت اللہ تعالیٰ میں، اس طرح گویا چلہ (اربعین لیلۃ) پورا ہوگیا، ایک دن کے مزید
قیام سے یہ برکت بھی حاصل ہوگئی۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ

حاضری مکہ مکرمہ کے زمانے میں جب تک صحت درست رہی، چار وقت کی نماز باجماعت
(باستثنائے ظہر) مسجد الحرام میں ادا ہوتی رہی، کبھی کبھی ظہر بھی، جمعے ساتوں باجماعت ادا ہوئے،
نماز صبح و مغرب کے بعد طواف کا شرف حاصل ہوتا تھا، استلام نجدیوں اور حجاج کے ہجوم
کی وجہ سے کمتر نصیب ہوا، زیادہ تر اشارہ ہوا، طواف میں ایذا دینے اور ایذا سے بچنے کا حکم
برابر ملحوظ رہا، بعد حج ایک بار ایک طواف میں سات بار بہ اطمینان استلام کی سعادت
حاصل ہوئی، آٹھ مرتبہ اُس دفعہ بھی استلام نہ ہوسکا، کبھی کبھی مسجد الحرام میں ادائے تہجد
اور بعد تہجد طواف کا شرف بھی ملا، ایک مرتبہ تہجد کے وقت اوپر سے اترا تو نیچے دروازہ پر ایک
معمر درویش پیاس سے بیتاب کھڑے تھے، مجھ سے پانی طلب فرمایا، لاکر پلایا، دعا دی اور کہا
کل کے روزے کی نیت کی ہے۔

دورانِ طواف میں رکن شامی کی دعا میں جب الفاظ یا عزیز یا غفور زبان پر آئے،
قلب نے قریباً ہمیشہ ایک رقت آمیز کیف محسوس کیا، کیا عجب کہ ذوقِ حضور ہو، فالحمد للہ
حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ روایت میں ہے کہ مقام موصوف پر ایک فرشتے دعائے حجاج پر

آمین کہنے پر مامور ہیں۔

ایک بار سلطان کی جار دب کشی کی عزت بھی نصیب ہوئی، آغا سے بہ التجا جار دب لی، ایک اشرفی اس سرفرازی کی نذر دی۔

حرم شریف کے کبوتر

حرم شریف میں کبوتروں کی کثرت ضرب المثل ہے، حجاج دانے سے ضیافت کرتے رہتے ہیں، میں نے بھی متعدد مرتبہ یہ ضیافت کی، ہزاروں کبوتر جمع رہتے ہیں، وحشت کم کرتے ہیں، دو باتیں عجیب دیکھیں، باوجود تلاش ان کی بیٹ حرم شریف میں نظر نہ آئی، میں نے بعض ساتھیوں سے کہا کہ تم بھی دیکھو، دیکھی نہ پائی، دوسرے یہ کہ بارہا دیکھا کہ ہزاروں کبوتر اڑ کر خانہ کعبہ کی جانب چلے، جب قریب پہنچے ادھر اُدھر پھٹ گئے، کبھی اوپر سے نہیں گذرے صرف ایک مرتبہ ایک کبوتر ذرا کنارہ کے اوپر سے گذر گیا تھا، اپنے مکان میں بیٹھا ہوا یہ نظارہ سلسل میں دیکھتا رہتا تھا،

(باقی)

سیر الصحابہ
جلد ششم

مؤلفہ مولانا شاہ معین احمد ندوی

اس میں عہد صحابہ کی چار اہم ہستیوں حضرات حسینؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن زبیرؓ کے مفصل حالات و سوانح، اخلاق و فضائل اور ان کے مذہبی، اخلاقی اور سیاسی مجاہدوں اور کارناموں کی تفصیل ہے، واقعہ کربلا اور امیر معاویہؓ کے متعلق اردو میں اس سے زیادہ مستند اور تحقیقی حالات نہیں مل سکتے۔

جدید اڈیشن ۔ ۳۱۶ صفحے ۔ قیمت:۔ چھ روپے

منیجر

تہذیب کی تشکیلِ جدید

از

جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

علم وحی کے ذریعہ انسان کی سائنس سے واقفیت ہوتی ہے

علم وحی کے ذریعہ زندگی کے راز اور انسان کی سائنس سے واقفیت ہوتی ہے جن کی دریافت سے مادی فکر و نظر کا انسان عاجز ہو چکا ہے، اور چاروناچار ذہنی و قیاسی انسان پر اپنے وضع کردہ اصول و نظریات منطبق کرنے لگا ہے،

زندگی کا راز تحت الشعور میں پوشیدہ ہے، اور انسان کی سائنس ماورائے مادہ پرواز میں مخفی ہے، اس لیے ان دونوں تک رسائی اُس انسان کے بس سے باہر ہے جس کو عقل و ہوش نے اختراع کیا، صنعت نے پیدا کیا، اور پھر تحقیق کے ذریعہ اس کو سرتا سر مادی بنا دیا۔

علم وحی کے مطابق تہذیب میں نیچرل کانسٹی ٹیوشن کا لحاظ ہوتا ہے

علم وحی کے مطابق جس تہذیب کی تشکیل ہوتی ہے اس میں نیچرل کانسٹی ٹیوشن کے مطابق شخصیت سازی کائناتی تصرفات دونوں پر زور دیا جاتا ہے،

چونکہ انسان میں مادیت و ماورائیت دونوں کی نمود ہے، پھر معاملہ خود اس کی ذات کا ہے جس میں اس کی توانائیاں بالعموم جواب دیدیتی ہیں اس بنا پر شخصیت سازی کے لیے اسکی رہنمائی

کے بغیر چارہ نہیں ہے، جو عقل و تجربہ سے ماوریٰ ہو کر مادیت و ماورائیت دونوں کی نمایندگی کر سکتی ہو

اگر اس کے لیے عقل و تجربہ کی رہنمائی کو کافی سمجھ لیا جائے تو صرف مادی حصہ کی نمایندگی ہوگی، اور ماورائی حصہ غلط رہنمائی کا شکار ہو کر زندگی کو زندگی سے گریزاں اور تہذیب کو خودکشی پر آمادہ کر دیگا، جیسا کہ مغربی تہذیب میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔

بلکہ پورے مادی حصہ کی بھی نمایندگی نہ ہو سکے گی کیونکہ زندگی کا بیشتر حصہ محض جذبات کی نیرنگیوں اور ہوس کی تاریکیوں میں گذرتا ہے، جس میں نہ عقل کی رہنمائی کام دیتی ہے اور نہ کسی تجربے کو کوئی خاص فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ عقل و تجربہ اس قدر زود اثر و متلون مزاج ہیں کہ ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی زمانہ کے افراد اور ایک ہی شخص کے احوال میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، ایسی حالت میں ان دونوں کو کافی سمجھنے کے بعد زندگی اور تہذیب کا جو حشر بھی ہو جائے وہ کم ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب عقل و ہوس میں امتیاز کی کوئی صورت نہ ہو اور تجربات پر ہر شخص کی طبعی افتاد کے خول چڑھنے کا قوی اندیشہ ہو۔

انسان کے مقابلہ میں کائناتی تصرفات زیادہ آسان ہیں

انسان کے مقابلہ میں کائناتی تصرفات کا معاملہ زیادہ آسان ہے، کیونکہ انسان خود حاکم و متصرف ہے اور نوع بنوع ترقیات اسی کی غیر محدود خواہشوں اور ضرورتوں کی پیداوار ہیں، اس بنا پر تصرفات کے لیے مذکورہ رہنمائی کی ضرورت زیر نہیں ہے، مرکز و بنیاد متعین کر لینے کے بعد عقل و تجربہ کی رہنمائی سے کام چلتا رہتا اور ارتقاء جاری اور رہتا ہے،

قرآن حکیم میں ہے

قل انما اعظکم بواحدۃ — آپ کہہ دیجئے میں تمہیں ایک بات کی نصیحت

ان تقوموا للہ مثنی وفرادی ثم تتفکروا ما بصاحبکم من جنۃ (سبا - ۶)

کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کے لیے دو دو ایک ایک کھڑے ہو جاؤ پھر غور و فکر کرو تمہارے صاحب (محمدؐ) کو جنون نہیں ہے۔

علم وحی کا سرچشمہ ربانی توانائی ہے

علم وحی کا سرچشمہ ربانی توانائی ہے جس سے اخذ و استفادہ کیلئے صلاحیت اور ماورائی حصہ کی تربیت درکار ہے، چنانچہ جس کے پاس وحی آتی ہے، ابتدا ہی سے اس کے ماورائی حصہ میں ایک چشم بصیرت موجود ہوتی ہے جس کے ذریعہ غیب کا مشاہدہ اور ان امور کا ادراک ہو سکتا ہے جن کے ادراک سے عقل عاجز رہتی ہے۔

ذرائع علم کی دو قسمیں ہیں

ذرائع علم کی دو قسمیں ہیں (۱) مادی اور (۲) غیر مادی

مادی وہ ذرائع ہیں جن کا مرکز جسم ہے، اور غیر مادی وہ ہیں جن کا مرکز ماورائے جسم ہے، پہلی کی کئی قسمیں ہیں، حسیات، بدیہیات اور عقلیات وغیرہ، اسی طرح دوسری کی کئی قسمیں ہیں، کشف، الہام اور وحی وغیرہ۔

جس جگہ پہلی کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں سے دوسری کی ابتدا ہوتی ہے اور جس جگہ دوسری کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں سے ماوراء الوریٰ شروع ہو جاتا ہے، یعنی پہلی کی انتہا، عقلیات ہے جس کا مرکز اگرچہ جسم ہے لیکن وہ ماورا سے نہایت قریب ہے، اور دوسری کی انتہا وحی ہے جس کا مرکز اگرچہ ماورا ہے لیکن وہ ماوراء الوریٰ سے نہایت قریب ہے۔

وحی غیر مادی ذرائع علم کا انتہائی مقام ہے

گویا "وحی" مادیت کے لیے غیر مادی ذرائع علم کا انتہائی مقام ہے جو انسانیت کی آخری سرحد پر ہے اور محض عطیۂ ربانی ہے۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ (جمعہ - ۱) — یہ (رسالت) اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے

دوسری جگہ ہے:

اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ — اللہ بہتر جانتا ہے جہاں اپنی رسالت کو رکھے

(انعام - ۱۵۰)

اس عطیۂ ربانی کے لیے خاص "ظرف" کی ضرورت ہے جس کی تربیت ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

وفتنٰک فتونا فلبثت سنین فی اھل مدین ثم جئت علی قدر یٰموسیٰ واصطنعتک لنفسی (طٰہٰ - ۲)

اے موسیٰ ہم نے تمھیں ہر طرح کی حالتوں میں ڈال کر آزمایا، پھر کئی برس تک تم مدین کے لوگوں میں رہے، بالآخر تم ایک مقررہ اندازہ پر پورے اترے، پھر میں نے تمھیں اپنے لیے منتخب کر لیا۔

آیت میں "قدر" سے وہ "ظرف" مراد ہے جس میں وحی کو سمونے اور جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے،

مفسرین نے "قدر" کے معنی بیان کیے ہیں۔

قدرنا لک سبیل المعرفۃ و وقتھا فجئت علی ذٰلک القدر (تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۳۲)

ہم نے تیرے واسطے معرفت کے راستہ اور اس کے وقت کا اندازہ کیا، پس تو اس اندازہ کے مطابق پورا اترا،

دوسرے معنی یہ بیان کیے گئے ہیں:

علی حد من الکمال المقدر بحسب استعدادک (تفسیر محی الدین ابن عربی ج ۲ ص ۳۷)

تو اپنی استعداد کے مطابق کمال مقدر کی حد پر پہنچ گیا۔

"ظرف" کی تربیت کے لیے بالعموم ان حالات سے گذارا جاتا ہے جو دوسرے لوگوں کو نہیں پیش آتے یا انکی برداشت سے باہر ہوتے ہیں،

مثلاً ہر صاحب وحی کے ذمہ بکریاں چرانے کی ڈیوٹی سپرد ہوتی ہے، اور اس کے ذریعہ جذب وانجذاب کی خاص کیفیت مطلوب ہوتی ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا

أکنت ترعی الغنم قال نعم وھل من نبی الا ورعاھا (مشکوٰۃ کتاب الاطعمۃ)

کیا آپ بکریاں چراتے تھے، فرمایا "ہاں" کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں

یا بڑی سخت آزمایش ہوتی ہے، اور اس کے ذریعہ زندگی کے ساز میں خاص نغمہ مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا

ای الناس اشد بلاء قال الانبیاء ثم الامثل فالامثل (ترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ باب عیادۃ المریض وثواب المرض)

سب سے زیادہ سخت آزمایش کس کی ہوتی ہے، آپ نے فرمایا انبیاء کی، پھر درجہ میں جو ان سے قریب ہوتا ہے، پھر ان کے جو قریب ہوتا ہے

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کتاب ملنے سے پہلے روزہ کی حالت میں کوہ طور پر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا، روزہ رکھکر سنسان جنگل میں عرصہ تک قیام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار حرا میں فکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت وغیرہ سب تربیت کے لیے تھا،

ماورا الوریٰ سے فیضان کی کئی شکلیں ہیں

تربیت کے بعد ایک نظم کے تحت ماورا الوریٰ سے فیضان شروع ہو جاتا ہے، جس کے حاصل کرنے میں مادی ذرائع کو کوئی دخل نہیں ہے،

اس فیضان کی کئی شکلیں قرآن حکیم میں مذکور ہیں،

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ
الا وحیا او من وراء حجاب
او یرسل رسولاً فیوحی باذنہ
من یشاء انہ علی حکیم
(شوریٰ - ۵)

اور کسی انسان کی تاب نہیں ہے کہ اللہ اس سے
بات کرے لیکن وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے
یا کسی قاصد کو بھیجے اور وہ اللہ کے حکم کے
مطابق جو اللہ چاہے وحی کرے، بیشک اللہ
بلند اور حکمت والا ہے،

یہ وہی فیضان ہے جس کا ذکر ابتدائی ہدایات اور ابتدائی نسل انسانی سے خطاب میں ہو چکا ہے، اور جس کے بغیر نہ انسان و کائنات کے نظام میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نہ مادیت و ماورائیت کی روح میں یکسانیت برقرار رہتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم
من فی السمٰوٰت والارض طوعا
وکرھا والیہ یرجعون (آل عمران - ۹)

کیا اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین ڈھونڈتے ہیں، حالانکہ اللہ ہی کے حکم میں خوشی یا لاچاری سے آسمان و زمین کی ساری چیزیں ہیں اور اسی طرف سب لوٹائے جائیں گے،

فیضان کا یہ سلسلہ ہر قوم و ہر گروہ میں جاری رہا ہے، اور اس کے ذریعہ راہ کی نشاندہی اور تہذیب کی تشکیل ہوتی رہی ہے،

لکل قوم ھاد (رعد - ۱)

ہر قوم کے لیے راہ بتانے والا ہوا ہے

دوسری جگہ ہے:

وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر
(فاطر - ۳)

اور کوئی امت نہیں ہے جس کے بیچ ڈر سنانے والا نہ ہو چکا ہو،

اس فیضان میں ارتقاء و تسلسل پایا گیا ہے

اور تسلسل کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے،

ثم ارسلنا رسلنا تترا (مومنون - ۳)

پھر ہم اپنے رسول لگاتار بھیجتے رہے

دوسری جگہ ہے

ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات
بخیر منھا او مثلھا (بقرہ - ۱۳)

جس آیت کو ہم منسوخ کر دیتے یا بھلا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس کے برابر بھیجتے ہیں،

انسانیت کے معراج کمال پر فیضان کا خاتمہ ضروری ہو گیا ہے

اس تسلسل کے ذریعہ جب انسانیت معراج کمال پر پہنچ گئی تو اس فیضان کا خاتمہ ضروری ہو گیا کہ اس کے بغیر انسانیت کی حد بندی اور ماوراء الوریٰ کی سرحد پر سنگ نشان قائم ہونے کی کوئی شکل نہ تھی،

قرآن حکیم میں ہے

ما کان محمد ابا احد من رجالکم
ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین
(احزاب - ۵)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں،

معراج کمال کا یہ فیضان (وحی) ہر طرح کامل و مکمل ہے،

وتمت کلمۃ ربک صدقا و
عدلا (انعام - ۱۴)

آپ کے رب کی سچائی اور انصاف کی باتیں پوری ہو گئیں،

اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے،

لا مبدل لکلمتہ (انعام - ۱۴)

رب کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے،

کیونکہ تبدیلی اعلیٰ یا ادنیٰ کی طرف ہوگی، اعلیٰ کی طرف اس لیے نہیں ہو سکتی کہ یہ انسانیت کی بالکل آخری سرحد پر ہے جس کے بعد کوئی درجہ نہیں ہے، اور ادنیٰ کی طرف اس لیے نہیں ہو سکتی کہ

ارتقاء کے بعد رجعت قہقری کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

معراج کمال کا فیضان انسانیت کی آخری سرحد پر ہے

اس میں شک نہیں کہ یہ فیضان (وحی) انسانیت کی آخری سرحد پر ہوتا ہے اور اس کے بھی درجات و مراتب ہیں جن کے آخری کنارہ پر معراج کمال کا فیضان ہے، لیکن ہر صاحب وحی بشریت کے جامہ میں ہوتا ہے، وہ نہ ربانی توانائی کا سہیم و شریک بنتا ہے، اور نہ کسی اعلیٰ و ادنیٰ مخلوق میں تبدیل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے

قالت لهم رسلهم ان نحن
الا بشر مثلكم ولكن الله يمن
على من يشآء من عباده (ابراہیم-۲)

ان کے رسولوں نے کہا کہ ہم تمھاری ہی طرح
بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر
چاہتا ہے احسان کرتا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پوزیشن واضح کرنے کا حکم ہوا ہے

قل انما انا بشر مثلكم يوحى الى
انما الهكم اله واحد
(کہف - ۱۲)

آپ کہہ دیجئے کہ میں تمھاری ہی طرح ایک
بشر ہوں مجھ پر وحی کیجاتی ہے کہ تمھارا معبود
ایک ہی معبود ہے۔

دوسری جگہ ہے :-

قل انما انا بشر مثلكم يوحى الى
انما الهكم اله واحد فاستقيموا
اليه واستغفروه
(حٰم السجدہ - ۱)

آپ کہہ دیجئے کہ میں تمھاری طرح بشر ہوں،
مجھ پر وحی کیجاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی
معبود ہے، اس کی طرف سیدھے رہو اور
اس سے گناہوں کی معافی چاہو۔

انسانیت کا یہ مقام جس قدر نازک ہے اسی قدر ناگزیر و ضروری ہے، اگر انبیاء علیہم السلام جامۂ بشریت میں نہ ہوں تو انسانی تقاضوں کے مطابق رہنمائی نہ کر سکیں اور اگر آخری سرحد

نہ ہو تو رہنمائی کے لیے مناسب اخذ و استفادہ نہ ہو سکے،

اس کی نزاکت کا حال یہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اس "مقام" کو سمجھنے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں ہوئی ہیں، کسی نے اسقدر بڑھایا کہ اس کو خدا کا مثیل، اس کا مظہر، اس کا روپ، دیوتا، اوتار، اس کا بیٹا تک بنا دیا۔ اور کسی نے اس قدر گرایا کہ ہر پیشینگوئی کرنے والے کو انبیاء کا درجہ دیدیا، اگرچہ وہ معصوم نہ ہو اور اس کے اخلاق پاکیزہ نہ ہوں۔

یہ مقام انتہائی نازک و باریک ہے

یہ منزل جہاں ختم ہوتی ہے وہ مقام اس قدر بلند ہے کہ مادی مخلوق کا کیا سوال خالص ماورائی مخلوق بھی وہاں تک جانے سے عاجز ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

ثم رفعت الى سدرة المنتهى[1]

پھر میں سدرۃ المنتہیٰ تک اٹھایا گیا،

یہ وہ مقام ہے کہ اس تک کسی دوسری مخلوق کی رسائی نہیں۔

ولم يتجاوزها احد الا رسول
الله صلى الله عليه وسلم[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی اس
مقام تک نہیں گذرا

لیکن اس کے باوجود یہ انسانیت و عبدیت ہی کا مقام ہے جس میں الوہیت کا شائبہ تک نہیں ہے، قرآن حکیم میں ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ
لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا
حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا
(بنی اسرائیل - ۱)

پاک ہے وہ ذات جو رات کے وقت اپنے
بندہ کو مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ
تک لے گیا جس کے گرد اگرد ہم نے برکتیں
نازل کی ہیں تا کہ وہ اپنے بندہ کو اپنی
نشانیاں دکھائیں۔

---

[1] بخاری جلد ۲ باب حدیث اسراء، [2] حاشیہ بخاری حوالہ بالا

شان عبدیت کے ساتھ ماوراء الوریٰ سے قرب کا ذکر اس آیت میں ہے

فکان قاب قوسین او ادنیٰ	پھر دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ
فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ	رہ گیا، پھر وحی کی اپنے بندہ کی طرف
(نجم - ۱)	جو وحی کی،

ماوراء الوریٰ کے قوانین مادیت کے قوانین سے بالکل مختلف ہیں

ماوراء الوریٰ سے قرب میں مادی قوانین ختم ہو جاتے ہیں، زمان و مکان کی قیدیں باقی نہیں رہتیں، حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور براہ راست ربانی توانائی سے اخذ و استفادہ ہوتا ہے،

ظاہر ہے اس مقام کو سمجھنے کے لیے مادی ذرائع علم ناکافی ہیں، اگر ان ذرائع سے حقیقت تک رسائی کی کوشش کیجائے تو اسی طرح ناکامی ہوگی جس طرح حیوان کی حسیات کے ذریعہ انسان کی عقلیات کو سمجھنے میں ہوگی، غالباً اسی وجہ سے قرآن حکیم نے بات نہایت مختصر کر دی ہے.

لنریہٗ من اٰیٰتنا (نجم - ۱)	تاکہ ہم بندہ کو اپنی نشانیاں دکھائیں.

دوسری جگہ ہے

لقد رای من اٰیات ربہ	بے شک اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی
الکبریٰ (بنی اسرائیل - ۱)	نشانیاں دیکھیں،

فیضان کی ضرورت ہمیشہ اور ہر دور میں رہتی ہے

ارتقائے انسانیت کی آخری منزل ختم ہونے کے بعد فیضان (وحی) کا سلسلہ اگرچہ ختم ہو گیا ہے، لیکن اس کی ضرورت ہمیشہ اور ہر دور میں رہتی ہے، کیونکہ انسان میں دو قسم کی توانائیاں ہیں: (۱) نورانی اور (۲) حیوانی.

نورانی فطرت کی پیدا کردہ ہیں اور حیوانی اجزائے ترکیبی کے خواص سے ابھری ہیں،

ان دونوں کے اپنے اپنے تقاضے اور مطالبے ہیں، جن میں باہمی کشمکش اور غالب آنے کی کوشش جاری رہتی ہے،

انسان چونکہ طبعاً اجزائے ترکیبی کے خواص کی طرف مائل ہے، اور آسانی سے حیوانیت کے آثار و مظاہر میں الجھ جاتا ہے اور کبھی تو یہ الجھاؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وجدان و احساس کا ذائقہ تک بدل جاتا ہے، اور مٹھاس میں بھی کڑواہٹ محسوس ہونے لگتی ہے، اس بنا پر نورانی توانائی کو ابھارنے اور دونوں میں عدل و توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک منظم پروگرام ناگزیر ہے، کیونکہ ایک نظم کے ساتھ جب تک مثبت و منفی تاروں کے چھیڑنے کا نظم نہ ہو، زندگی میں وہ نغمہ نہ پیدا ہو سکے گا، جو ساز کا مقصود و مطلوب ہے.

دراصل اسی نغمہ کو پیدا کرنے کے لیے فیضان کی ضرورت ہوئی اور صفحہ ہستی پر جب تک انسان کا وجود باقی ہے، بدستور اس کی ضرورت رہے گی،

قرآن حکیم میں ہے:

ھو الذی بعث فی الامیین	وہ اللہ جس نے امیوں میں انہی میں سے
رسولا منھم یتلوا علیھم	ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں
اٰیتہ ویزکیھم ویعلمھم	سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب
الکتٰب والحکمۃ (جمعہ - ۱)	اور حکمت سکھاتا ہے.

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے،

لقد من اللہ علی المومنین اذ	بیشک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا ہے
بعث فیھم رسولا منھم یتلو	کہ ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انکو
علیھم اٰیتہ ویزکیھم ویعلمھم	اس کی آیتیں سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور

الکتب والحکمۃ (آل عمران ۔ ۱۷) ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے،

ایک اور جگہ ہے

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت و بیشک ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی دلیلیں

انزلنا معھم الکتٰب والمیزان دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان

لیقوم الناس بالقسط (حدید ۔ ۳) اتاری تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں،

ضرورت پوری کرنے کے لیے حفاظت کا خصوصی اہتمام ہے

اس فیضان کی ہدایت و رہنمائی ابد الآباد تک کے لیے تھی، اسلیے خود ربانی قوت نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ لی، قرآن مجید میں ارشاد ہے

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ ہم ہی نے یہ قرآن اتارا اور ہم ہی اسکی

لحفظون (حجر ۔ ۱) حفاظت کرنے والے ہیں

پھر اس فیضان کو ہمیشہ کے لیے عملی تشکل میں تشکل کرنے کے لیے صاحب وحی کی زندگی کو "نمونہ" بنا کر اس کی حفاظت کا بھی اہتمام کیا گیا،

لقد کان لکم فی رسول اللہ بیشک تمہارے لیے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ

اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ ہے، اس کے لیے جو اللہ کی اور آخرت کے

والیوم الاٰخر وذکر اللہ کثیرا دن کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت

(احزاب ۔ ۳) یاد کرتا ہے

اس "نمونہ" کو جن لوگوں نے اپنی زندگی میں رچایا اور بسایا ان کو بعد والوں کے لیے نمونہ بنانے کا حکم دیا گیا۔

لیکون الرسول شھیدا علیکم تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر

وتکونوا شھداء علی الناس (حج ۔ ۱۰) گواہ ہو۔

دوسری جگہ ہے:

وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا اور اسی طرح بنایا ہم نے امت معتدل

لتکونوا شھداء علی الناس تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر

ویکون الرسول علیکم شھیدا (بقرہ ۱۷) گواہ ہو،

ارتقا ختم ہونے کے بعد بھی تسلسل موجود ہے

اس طرح فیضان کا ارتقا ختم ہونے کے بعد بھی اس کا تسلسل موجود ہے، جس سے استفادہ جاری رہ سکتا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے

تامرون بالمعروف وتنھون وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور

عن المنکر وتؤمنون باللہ (آل عمران ۱۲) برائی سے باز رکھتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو،

استفادہ سے محرومی میں زندگی خود زندگی سے گریزاں اور تہذیب خودکشی پر مجبور ہوگی

اگر اس استفادہ سے محرومی رہی تو زندگی میں نغمہ نہ پیدا ہوسکے گا، اور وہ اپنے سے گریزاں رہے گی،

اسی طرح اگر تہذیب کی تشکیل میں استفادہ نہ کیا گیا تو نہ ماوراء الوریٰ سے ربط و تعلق پیدا ہوگا اور نہ زندگی کے ماورائی حصہ کی نمایندگی ہوسکے گی، اور اس تہذیب سے عدل و توازن مفقود ہوکر تہذیب خودکشی پر مجبور ہوگی،

ماوراء الوریٰ سے ربط و تعلق حیرت و خوف کا نہیں ہے، بلکہ رحمت و محبت کا ہے

والذین اٰمنوا اشد حبا اور جو لوگ ایمان لائے ان کو اللہ

للہ (بقرہ ۔ ۱۹) سے نہایت قوی محبت ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے:

ورحمتی وسعت کل شیء (اعراف ۱۹) میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے

اور اسی وقت سے ہے جبکہ "نیچرل کانسٹی ٹیوشن" بھی تیار نہ ہوا تھا، انسان سے یہ عہد لیا گیا تھا

واذ اخذ ربک من بنی اٰدم	اور جب آپ کے رب نے بنی آدم کی
من ظھورھم ذریتھم واشھدھم	پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور
علی انفسھم الست بربکم	ان سے ان کی جانوں پر اقرار کرایا کہ کیا
قالوا بلی شھدنا ان تقولوا	میں تمھارا رب نہیں ہوں، انھوں نے
یوم القیمۃ انا کنا عن ھذا	کہا، ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں کبھی قیامت
غفلین (اعراف - ۲۱)	کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اسکو بھول گئے تھے،

اس لیے جو تہذیب اس سے غفلت برتے گی اس کو نہ زندگی کا سر چشمہ و مقصد معلوم ہو گا اور نہ سمت سفر و منزل کی نشاندہی ہو سکے گی،

(باقی)

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور پھر یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

صفحے ۴۳۲ قیمت ۵۰ روپے ۵۰ پیسے

منیجر

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

۲- ضلع بریلی

از

جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی

(۵)

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان رزوں اب تو سر سبز یہاں باغِ سخن دیکھتے ہیں

(برج موہن لال خمار)

ضلع بریلی اگرچہ شمالی ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کے ایک قدیم ترین مرکز یعنی بدایوں سے ملحقہ ضلع ہے، پھر بھی یہاں اہل علم و صاحب تصانیف اصحاب کا ذکر اواخر عہد مغلیہ سے قبل نہیں ملتا، عہد شاہجہانی میں بریلی کو صوبائی صدر مقام بنایا گیا۔ اس کے بعد سے یہاں علمی و ادبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے، پہلی ذی علم شخصیت جس کا بریلی سے تعلق ہے اور جس کے متعلق ہمیں علم ہے، رفیع خاں باذل ہیں، جو عہد شاہجہانی میں مختلف اوقات میں مختلف صوبوں کے صوبیدار رہے، اور طاہر وحید کے بھتیجے تھے، ۱۶۷۹ء میں بریلی کے صوبیدار مقرر ہوئے تھے، باذل ایک پرگو اور خوش گفتار شاعر تھے، مجموعۂ غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی حملۂ حیدری کے بھی مصنف ہیں، جو حقیقتاً معارج النبوت کی منظوم شکل ہے اور جس میں شاہنامہ کے طرز پر غزوات نبوی کو نظم کیا گیا ہے، اس مثنوی میں بقول بندرا بن خوشگو اور شاہ نواز خاں چالیس ہزار

اور بقول آزاد بلگرامی نوے ہزار اشعار تھے۔ باذل کا انتقال بہادر شاہ اول کے عہد میں ۱۱۲۳ھ / ۱۷۱۱ء میں ہوا[۱]، ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

دل و اشتیم دادیم جان بود عرض کردیم   چیز یکہ یار خواہد صبر نیست و ما نداریم

ہشدار کہ آں چشم سیہ بر سر مستی ست   ہر یک مژہ برہم زدنش تیغ دو دستی ست

امشب چو شمع ریخت زہر تار زلف ما   ہر گریہ کہ بود گرہ در گلوئے ما

چہ نشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو   بدل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو

تو چناں رمیدی از من کہ بخواب ہم نیائی   بکدام امیدواری بردم بخواب بے تو

عشق را با ہر دے نسبت بقدر جوہر ست   قطرہ بر گل شبنم و در قعر دریا گوہر ست

باذل کے ہم عصر ایک دوسرے فارسی گو ایرانی نژاد شاعر جن کا بریلی سے تعلق تھا، حکیم عبدالرزاق مشرب تھے، وہ اواخر عہد عالمگیری میں اصفہان سے ہندوستان آئے اور بریلی میں سکونت اختیار کی اور وہیں قرابت داریاں کیں، لیکن مستقل قیام نہیں کیا، بریلی سے ترک سکونت کے بعد کچھ عرصہ تک لکھنؤ میں، پھر کچھ زمانے تک نوازش خاں طالع کے ہمراہ کشمیر میں رہنے کے بعد آخر عمر میں سندھ چلے گئے، اور وہیں ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۳-۲۴ء میں ان کا انتقال ہوا، آزاد بلگرامی کے بقول انھوں نے ایک لاکھ اشعار کا دیوان مرتب کیا تھا، ان کی پرگوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک دن میں سات سات آٹھ آٹھ غزلیں کہتے تھے[۲]۔

ان کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

بخون گل حنائی کردہ پا چیباک می آید   دل صد چاک بلبل در تماشا چاک می آید

بہ گمشت مستیٔ دنب لہ دار ما   ایں بادہ راز چشم کہ ایجاد کردہ اند

---

[۱] مآثر الامراء ج سوم ص ۴۰۹۔ کلمات الشعراء (مخطوطہ رامپور)، سرو آزاد، ص ۱۴۳، سفینۂ خوشگو ص ۷۵، نتائج الافکار، ص ۱۱۱

[۲] سفینۂ خوشگو ص ۱۰۱ (الف)

دل از شوق شہادت اضطراب سا کنی دارد   چو جوہر جسم من شد موجۂ دریائے شمشیرش

قدرت اللہ شوق کے بیان سے عہد محمد شاہی میں بھی یہاں کے ایک فارسی گو شاعر کا پتہ چلتا ہے، یہ نواب ہدایت علی خاں ہیں جو اسی عہد میں صوبیدار پٹنہ، بریلی اور بقول شوق فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے[۱]۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

روہیلہ سرداروں خصوصاً حافظ رحمت خاں (پیدائش ۱۷۰۸ء شہادت ۱۷۷۴ء) کا دور حکومت بریلی کا عہد زریں تھا، انتظام حکومت کی بہتری اور عام خوش حالی کے ساتھ ساتھ اس عہد میں بریلی کو علمی مرکزیت حاصل ہوئی، اس زمانہ میں یہاں کی دولت کی کشش اور اہل فضل کی قدر دانی کی شہرت علماء کو دور دور سے کھینچ کر کٹھیر کے مختلف شہروں میں لا رہی تھی، اس عہد میں اہل علم کی قدر دانی کا اندازہ مستجاب خاں کی درج ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے[۲]:

"پنج ہزار فاضل و عالم و طالب علم برونق علم و فضل ما وجب می یافتند و برائے ہر یک از فضلاء و علماء کہ بہ درس و تدریس اشتغال می نمودند مدارس و مساجد از سرکار صورت اتمام پذیرفتہ بود و کتب درسی متعدد و در ہمہ مدارس از حضور مقرر بودند تا بفراغ بال بتعلیم خلائق و عبادت خالق بردازند و خرچ طلباء سوائے نوکران سرکار از نقد و طعام بطریق یومیہ در ہر مدارس می رسید و چون طالبعلمے بدرجۂ فضیلت می رسید، علماء جمع شدہ آں را بحضور می آوردند و آں حضرت دستار فضیلت، کہ متعارف علمائے روزگار ماست، از دست خود بر سر او می بستہ و شیرینی و طعام وافر بنیاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از سرکار مہیا و مرتب ساختہ جمیع علماء و فضلاء را احضار فرمودہ می خورانیدند

---

[۱] طبقات الشعراء، مخطوطہ دارالمصنفین اعظم گڈھ [۲] گلستان رحمت (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور) ورق ۱۰۶ (الف)

و آں فاضل را در زمرۂ علماء منسلک نمودہ تنخواہ موافق دیگر علماء و فضلاء مقرر می کردند
و سوائے تعلیم و تعلم بہ ایشان کارے نمی فرمودند ......"

اس کی تصدیق سعادت یار خاں کی مندرجۂ ذیل عبارت سے ہوتی ہے:[1]

"...... و علی ہذا القیاس بہ استماع خبر قدر شناسی و دین پروری حافظ الملک
صدہا علمائے متبحر مثل مولانا عبد العلی لکھنوی وغیرہم در تمامی شہرہائے کٹھیر مجتمع شدہ، مواجب
کثیر زیادہ از حاجت از سرکار می یافتند و در مدارس کہ برائے ایشان از سرکار ترتیب یافتہ
بود بفراغ بہ درس و تدریس اشتغال می ورزیدند و در ہر مدرسہ کتب درسی و وظیفہ طلباء
از سرکار تعین می یافت و ہرگاہ طالبعلمے بہ درجۂ فضیلت می رسید، علماء جمع شدہ او را
بحضور می آوردند و حافظ الملک بدست خود دستار فضیلت بر سرش بستہ مواجب او
موافق دیگر علماء مقرر می فرمودند و آں قدر تکریم علماء می کردند کہ ہرگاہ از سفرے مراجعت
می نمودند و علمائے مدرس برائے ملاقات حاضر می شدند بہ عذر خواہی پیش آمدہ بہ ایشان
می فرمودند کہ چرا سبقت نمی نمودید ...... و در عہد ریاست حافظ الملک اہل کاران
یارائے آں نبود کہ پیش ایشان دم خلاف زدن می توانست۔"

اس عہد میں اہل علم کی سرپرستی کی گواہی ایک دوسرے اسی دور کے مصنف کندن لال اشکی
نے بھی دی ہے، وہ اپنی تصنیف نزہت الناظرین میں رقمطراز ہیں کہ خود ان کی بریلی کے تقریباً
تین سو طالبعلموں سے ملاقات تھی،[2] اہل علم کے قدرداں ہونے کے علاوہ حافظ رحمت خاں خود بھی
شاعر تھے،[3] اور پشتو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر موزوں کرتے تھے، مشہور مستشرق

[1] گل رحمت (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور) ورق ۸۰ الف، [2] ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں (مصنفہ مولانا
ابوالحسنات ندوی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ) [3] حیات حافظ رحمت خاں (مصنفہ الطاف بریلوی)
ص ۲۹۶

ایم۔ ڈارمیسٹیٹر (M. Darmestater) کی گواہی پر سر جان اسٹریچی (Sir John-Strachey) نے لکھا ہے کہ اس عہد کے روہیلوں میں حافظ رحمت خاں صاحب دیوان
مشہور تھے، اور ڈارمیسٹیٹر نے ان کی ایک پشتو غزل خود ایک ایسے مجموعہ میں دیکھی تھی جو اب
برٹش میوزیم میں محفوظ ہے،[1]

افسوس ہے کہ حافظ الملک کا فارسی کلام اب دستیاب نہیں ہوتا، اسٹریچی کے بیان
سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ الملک کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جو ان کی شہادت
کے بعد اودھ منتقل ہو گیا تھا، اور شاہان اودھ کے ۱۸۵۷ء میں تلف ہونے والے مشہور
کتب خانہ کا بڑا حصہ اسی کتب خانہ کی کتابوں پر مشتمل تھا،[2]

حافظ رحمت خاں کے معاصرین میں بھی کئی فارسی شاعر گذرے ہیں، مولوی احمد خاں احمد
شاہجہاں پوری حافظ الملک کے درباری تھے، اور مدتوں ان کی صحبت میں بریلی اور پیلی بھیت
میں رہے، قدرت اللہ شوق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قصائد عربی و غزلیات فارسی کے
مجموعے مرتب کیے تھے، لالہ سری رام نے بھی انھیں صاحب دیوان شاعر لکھا ہے، لیکن ان کا
دیوان ناپید ہے،[3] ان کے ایک دوسرے معاصر میر محمد نعیم نعیم ہیں، جن کا قدرت اللہ شوق
نے تکملۃ الشعراء میں اور انھیں کے حوالے سے امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں ذکر کیا ہے۔
ان کا اور مصحفی کا ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں امیر کے دربار میں ساتھ رہا ہے، بقول شوق وہ
شاہجہان آباد کے باشندے تھے لیکن وہاں کی تباہی کے بعد قصبۂ آنولہ کے متصل اتر چھنڈی
میں قیام پذیر ہو گئے تھے، ان کا انتقال ۱۱۹۴ھ کے قریب ہوا،[4] ان کے چند شعر بطور نمونہ پیش ہیں:

[1] Hastings and The Rohilla war, P. 295, 296 [2] ایضاً
[3] مخزن جاوید، جلد اول ص ۸۶، طبقات الشعراء [4] تذکرۂ ہندی ص ۱۳، انتخاب یادگار ص ۳۸۹۔ طبقات الشعراء
(مخطوطہ اعظم گڈھ)

چو شمع جملہ بدن صرف سوختن کردم ہنوز در دل من ذوق سوختن باقیست

نعیم از دیدن دزدیدہ اش دانستہ ام اکنوں کہ آں عیار با من دوستی در دل نہاں دارد

قاضی نور الحق منعم بھی اٹھارہویں صدی کے آخری دور کے فارسی گو شعرا میں تھے۔ ان کا وطن کھاتہ ضلع بریلی تھا، علوم مروجہ میں پوری مہارت اور بدیہہ گوئی میں کمال رکھتے تھے، ان کی موزونیٔ طبع کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک گھنٹہ میں سو سو شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ کلام اللہ کی شان نزول اور منظوم تفسیر کے علاوہ انھیں عربی و فارسی قصائد، متعدد مثنویوں، تین دواوین غزلیات فارسی اور بہت سے متفرق اشعار کا مصنف بتایا جاتا ہے۔ میر محمد خاں سرور کے بقول ان کے کل اشعار کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی، دہلی میں ان کی سرور سے ملاقات ہوئی تھی، اور شہنشاہ دہلی کے دربار سے انھیں عمدۃ الشعراء کا خطاب ملا تھا، سرور ان کے بہت مداح ہیں، اور انھیں "شخص عالم و متشرع و خوش اختلاط، سید صحیح النسب" لکھتے ہیں لیکن نواب علی حسن خاں (صاحب صبح گلشن) نے آفتاب عالم تاب کے مصنف کے حوالے سے سید لطف اللہ نامی ایک شخص سے اُن کی عشق کی داستان بیان کی ہے، جو کہ ان کی رسوائی کا باعث ہوئی[1]، منعم کے چند شعر نمونۃً پیش ہیں

رفتہ ایم از خود چناں کز ما مپرس احوالِ ما بے خودی می آید اکنوں بہرِ استقبالِ ما

منعما دور از محبت حالِ ما پرسیدۂ طالعِ ما، دولتِ ما، بختِ ما، اقبالِ ما

بردو کن نصیحت ز نظارہ بتانم کہ بخدمت تو ناصح ادبم ہنوز باقیست

اس عہد کے ایک دوسرے شاعر مہاراج سنگھ مسکین ولد کلونت رائے کا ذکر بھگوان داس ہندی نے سفینۂ ہندی میں کیا ہے، وہ اگرچہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے لیکن چونکہ بریلی کی وکالت کے

[1] صبح گلشن ص ۴۶۰ - عمدۂ منتخبہ ص ۶۵۳

عہدہ پر فائز تھے، اور ہندی سے مشورۂ سخن کرتے تھے، غالباً سکھ مذہب کے پیرو تھے، اس لیے کہ بھگوان داس ہندی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "پدر و پسر ہر دو از مریدانِ گرو نانک بودند"۔ مسکین کا انتقال سفینۂ ہندی کی تالیف یعنی ۱۲۱۹ھ (مطابق ۱۸۰۴ء) سے چند سال قبل ہوا[1]، ہندی نے ان کا درج ذیل شعر نقل کیا ہے۔

اے اشک در غم کہ چنیں جوش کردۂ یک قطرہ می نمودی و دریا بر آمدی

غلام محی الدین اویسی، قدرت اللہ شوق نے انھیں متوطن سرہند لکھا ہے لیکن سرور "از پیرزادہ ہائے سرہند" متوطن بریلی لکھتے ہیں، قدرت اللہ شوق کے بیان کے مطابق اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، شوق نے انکے فارسی کلام کا نمونہ پیش نہیں کیا ہے، اردو کلام کا نمونہ شعرائے اردو کے سلسلہ میں پیش کیا جائیگا۔

سید پائندہ مسافر بھی اسی دور کے ایک فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے، ان کا وطن دہلی تھا، لیکن بریلی میں آباد ہو گئے تھے، مگر روہیلوں کے زوال اور کٹھیر کی تباہی کے بعد خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کر لی تھی[3]۔

غالب کے مشہور معاصر میر نظام الدین ممنون کے والد میر قمر الدین منت کے متعلق اگرچہ زیادہ تر تذکرہ نگار رقمطراز ہیں کہ ان کا وطن سونی پت تھا، لیکن میر حسن نے انھیں "از نجیب زادہائے بسولی" لکھا ہے، منت فارسی کے زبردست شاعر تھے، اور میر محمد خاں سرور اور قدرت اللہ قاسم دونوں ان کے بیحد مداح ہیں، سرور لکھتے ہیں کہ "الحق تعریف و توصیف کمالاتِ شاعری آں یگانۂ عہد بیش از آن است کہ در سلکِ انشا در آید...... در فارسی گوئی علمِ استادی بہ اعتبار افراشتہ"۔ اور قدرت اللہ قاسم رقمطراز ہیں کہ "حد و حصر قابلیت او آں قدر نیست کہ بہ شرح و بسط در آید"۔ نظم و نثر میں انھوں نے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں،

[1] سفینۂ ہندی ص ۱۹۶ [2] طبقات الشعراء (مخطوطہ کتبخانہ دار المصنفین اعظم گڈھ) [3] طبقات الشعرا مخطوطہ کتبخانہ دار المصنفین اعظم گڈھ)

اور بقول علی ابراہیم خلیل ان کا ایک لاکھ بیت کا دیوان تھا، لیکن نساخ کے خیال میں صرف اشعار فارسی کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔ منت کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، علی ابراہیم خلیل ان کی وفات ۱۲۰۶ھ میں بتاتے ہیں، مصحفی نے "منت کجا ز مزمۂ شاعری او" سے ان کی تاریخ ۱۲۰۷ھ نکالی ہے، لیکن شیفتہ اور دوسرے تذکرہ نگار ان کا سال انتقال ۱۲۰۸ھ (مطابق ۱۷۹۳ء) لکھا ہے۔[1]

سودا کے مشہور شاگرد قیام الدین قائم کا قیام بھی عرصہ تک نواح بریلی (بسولی اور ٹانڈہ) میں رہا، ان کے لائق شاگرد اور دوست قدرت اللہ شوق کا تعلق اسی ضلع سے تھا، وہ تحصیل بہیڑی کے ایک گاؤں موی میں پیدا ہوئے اور علوم درسیہ مولانا غلام طیب بہاری سے حاصل کیے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، اور صاحب دیوان شاعر تھے لیکن ان کی اصل شہرت ان کی نثر کی تصانیف پر مبنی ہے، ان کا انتقال ۱۲۲۴ھ (مطابق ۱۸۰۹ء) میں ہوا، اور حکیم احمد خاں نے تاریخ وفات "چراغ شاعری از بزم شد" سے نکالی۔[2]

حافظ رحمت خاں کے بیٹے نواب محبت خاں محبت بھی اسی عہد کے شاعر تھے، عربی، پشتو اور اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، حافظ الملک کی شہادت کے بعد لکھنؤ میں مستقلاً مقیم ہو گئے تھے، اور وہیں ان کا ۸ ماہ صفر ۱۲۲۳ھ میں انتقال ہوا،[3] فارسی کلام کا نمونہ پیش ہے۔

---

[1] تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن) ص ۱۵۸، عمدۂ منتخبہ ص ۸۰۵، گلشن بیخار، ص ۱۹۳ [2] Persian literature (By C. A. Storey), Section II Fasciculus I P.143 and Vol I Part II P.877 تذکرۂ شعرائے رامپور (مصنفہ جان نثیم)۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۳۸۵۔ خمخانۂ جاوید، ج ۵ ص ۸۲ انتخاب یادگار، ص ۱۸۳، گلشن بیخار، ص ۱۱۲ [3] اخبار حسن (مخطوطہ رامپور) صبح گلشن، ص ۴۶۸ سفینۂ ہندی، ص ۱۹۱۔ گل رحمت (مخطوطہ رامپور) گلشن ہند (مطبوعہ لاہور) ص ۱۶۶، خوش معرکۂ زیبا (مخطوطہ ٹیگور لائبریری، لکھنؤ) ورق ۴۳ (ب) طبقات الشعراء

می تواں از دشتِ خاکم ساختن صد مجنوں کنوں — سوختہ از بس سراسر آتشِ سودا مرا

زیں حرف گر نشستم کہ بمن حرف نگوئی — کے حرف مرا می شنوی حرف دریں است

عاشق زادم مرا از درد پیدا کردہ اند — ای گواہم بس کہ رنگ زرد پیدا کردہ ام

چوں لالۂ دل سوختہ در گلشن و صحرا — ہر جا گذرم بے گلِ رخسار تو داغم

خونم حلال و سوختن و کشتنم بجا — چوں عاشق توام ہمہ باشد سزائے من

گر کششِ من اثرے داشتے — یار بسویم گذرے داشتے

گر رخش از پردہ بروں آمدے — شام محبت سحرے داشتے

میاں نثار احمد نامی محبت خاں کے معاصر تھے، ان کا وطن اگرچہ دہلی تھا لیکن مسکن بریلی تھا، سرور نے ان کا ذکر اس عہد کے شعراء میں کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ نمونۂ کلام فارسی پیش نہیں کیا۔[1]

سیف اللہ ثاقب خلف شیخ کفایت اللہ بریلوی بھی اسی دور کے فارسی گو شاعر تھے، وہ کریم الدین آزر مراد آبادی کے شاگرد تھے، نواب نصر اللہ خاں کے عہد میں عرصہ تک رامپور میں مقیم رہے، ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۱ء) میں ان کا انتقال ہوا، مجموعۂ غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی بنات النعش کے بھی مصنف تھے، لیکن یہ مثنوی اور تمام دوسرا کلام اب ناپید ہے، ان کا ایک شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہے۔[2]

وائے طولِ شبِ ہجر ثاقب — عمر خضر است کہ بے پایان است

اسی دور کے ایک اور شاعر میر طہور صندت تھے، جو قدرت اللہ شوق کے بیان کے مطابق حقیقتاً شاہجہاں پوری تھے، لیکن آنولہ میں نشو و نما پائی اور رامپور میں اقامت پذیر رہے۔[3]

---

[1] عمدۂ منتخبہ ص ۰۰۰، [2] تذکرۂ شعرائے رامپور، انتخاب یادگار، صفحہ ۱۰۱ [3] انتخاب یادگار، ص ۲۰۳

ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

مگر دیدہ است امروز آں نگاہ مے پرستش را   کہ امشب محتسب بالغزش مستانہ می آید
پژمردہ شود عارضش از تاب نگاہم   ایں آئینہ از جلوہ پرستاں گلہ دارد
در غم زلفِ او سیہ پوش است   سوگوار مرا تماشا کن

اس عہد میں تیوارام جوہر بھی بریلی میں گذرے ہیں، انھوں نے صرف و نحو پر فارسی نظم میں ایک کتاب جواہر الترکیب ۱۲۳۵ھ (مطابق ۱۸۲۰ء) میں تصنیف کی جو طبع بھی ہوچکی ہے،[1]

حافظ رحمت خاں کے ایک پوتے حافظ یار خاں خلف نواب ذوالفقار خاں بھی انیسویں صدی کے نصف اول دور کے شعرائے بریلی میں تھے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، اردو میں حافظ اور فارسی میں راغب تخلص کرتے تھے،[2] نمونۃً ان کا درج ذیل ایک شعر پیش ہے،

مریضِ عشقم و نومیدیم بیں   کز و امید پرسیدن ندارم

اسی زمانہ میں بریلی میں ایک بزرگ ہستی جن کا شاعری میں بھی بلند مقام ہے، شاہ نیاز احمد بریلوی کی تھی۔ ان کا مولد سرہند تھا، لیکن انھوں نے تحصیل علم دہلی میں شاہ فخر الدین سے کی اور انہی کے حسب الحکم بریلی آکر مقیم ہوگئے اور یہیں ششم جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۸۳۴ء) میں ان کا انتقال ہوا۔[3] فارسی اور اردو کلام پر مشتمل ان کا ایک دیوان شائع ہوچکا ہے، فارسی کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

ز مصحف رخ خوباں ہمیں نمود رقم   کہ خط و خال و رخ و زلف پرشکن ہمہ اوست
نظر بعیب مکن در ظہور باغ وجود   کہ طوطیان چمن، زاغ و بوم و زغن ہمہ اوست

[1] تکملۃ الشعراء (مخطوطہ رامپور)، [2] روز روشن ص ۲۳۴ [3] دیباچہ دیوان نیاز، ریاض الفصحا ص ۳۳۹، سخن شعرا ص ۵۳۶

ز بحر عشق چوں واقف شوی یقیں دانی   کہ قیس و لیلی و شیریں و کوہکن ہمہ اوست
شنیدہ ام بصنم خانہ از زبان صنم   صنم پرست و صنم گر، صنم شکن ہمہ اوست
رساند مطرب خوش گو ہمیں ندا در گوش   کہ چوب و تار و صدائے تنن تنن ہمہ اوست

حکیم بدیع الدین خلف شیخ محمد قائم محو کا ذکر بھی قدرت اللہ شوق نے اس عہد کے خوشنویس شعراء میں کیا ہے، ان کے متعلق رقمطراز ہیں کہ "جامعیت معدن قابلیت و مخزن اہلیت و در علم حکمت دسترس پیدا کردہ، در نظم و نثر مہارتے تمام دارد...... اگرچہ خوشنویس است اما شعر خوب می گوید"[1]

مہاراجہ رتن سنگھ زخمی کے والد راجہ بالک رام بریلی کے رہنے والے اور آصف الدولہ کے میر آتش تھے، ان کے نام سے توپ خانہ بالک رام ایک محلہ اب تک مشہور ہے، زخمی بھی شاہان اودھ کی خدمت میں منشی الملوک کی خدمت پر مامور اور فخر الدولہ کے خطاب سے ممتاز ہوئے، محمد علی شاہ کے عہد میں دیوان کے منصب پر فائز ہوئے اور مہاراجگی کا خطاب پایا، ۱۲۶۴ھ میں مشرف باسلام ہوئے اور ۱۲۶۷ھ (مطابق ۱۸۵۱ء) میں انتقال کیا۔[2] زخمی بیشتر عربی علوم، فارسی، ترکی، سنسکرت اور انگریزی سے واقف تھے، ان کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

زخمی اگرت چشم سفید است کہ دادی   نسبت بہ کف پائے کسے برگ سمن را
(کذا) ہزار تیغ بیک زخم کارم آساں کن   کہ نیست حل شدنی مشکلے کہ من دارم
کجاست نو سفر من کہ از نبود دل او   شدہ است بزم غم انگیز لیک من دارم
ز قتلم آں جفا جو ہم پشیمانی کشید آخر   کہ دید از مردنم بر در گرفتارے ندید آخر
چو می گفتم کہ مردم در غمت باور نبود او را   بحمد اللہ کہ او مرگم بچشم خویش دید آخر

[1] تکملۃ الشعراء (مخطوطہ رامپور) ص ۶۰۳ [2] صبح گلشن، ص ۱۸۹

زخمی کے ایک دوسرے ہم عصر ہندو شاعر کندن لال اشکی تھے۔ ان کا وطن بھی بریلی تھا، وہ بھی سلاطین اودھ کے خدمت گزار اور منشی الملوک کی خدمت پر ممتاز تھے، اس سلسلہ میں مدت تک لکھنؤ میں مقیم رہے، علوم حکمیہ انھوں نے شاہ رفیع الدین دہلوی سے حاصل کیے، اشکی کا انتقال ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۵۰ء) میں ہوا[1]، نمونۂ شعر پیش ہے،

ترک عشق است دوائے دل اشکی لیکن نتوانم نتوانم نتوانم چہ کنم

ہزاری لال وحید بھی اسی عہد کے ایک بریلوی فارسی گو شاعر تھے۔ اور بقول مصنف صبح گلشن "بلب ولہجۂ اہل زبان بزنگ ہزار داستان زبان کشود"[2]۔ نمونۂ ان کا ایک شعر پیش ہے

اے ہجر کشیدہ دیدہ واکن می گشت مرا بناز دمی گفت

پنڈت دیا ناتھ وفا بریلوی بھی اسی دور کے شاعر تھے جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ان کی ایک فارسی مثنوی گل و بلبل اور ایک دوسری اردو مثنوی داغ دل (جو ۱۲۳۳ھ میں تصنیف ہوئی) کے قلمی نسخے رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہیں، وفا کا آخری زمانہ عہد واجد علی شاہ میں لکھنؤ میں گزرا۔

غلام حضرت عشق بریلوی بھی اسی زمانہ کے شاعر تھے، وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے، اور ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۸۲۷ء) میں انھوں نے ایک دیوان فارسی مرتب کیا تھا، جو رامپور میں موجود ہے،

فتحیاب خاں ابن محمد دیدار خاں خلف حافظ رحمت خاں بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، ان کی ایک تصنیف ریاض سخن رامپور میں موجود ہے،[3]

متذکرہ بالا شعراء کے علاوہ انیسویں صدی میں کچھ اور شعرائے بریلی کا بھی پتہ چلتا ہے جو فارسی زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے، ان میں امین الدین بریلوی المتخلص بہ آزاد، ان کے

[1] روز روشن صفحہ ۵۰ [2] صبح گلشن ص ۵۸۹ [3] اخبار حسن (مخطوطہ رام پور)

بیٹے شیخ محمد یار علی استاد اور شیخ عطا حسین عطا بریلوی اس صدی کے نصف اول میں گزرے ہیں، ان کا ذکر سید ولی اللہ نے فرخ آباد جانے والے بریلوی شعراء کے سلسلہ میں کیا ہے،[1] اسی صدی کے نصف آخر میں ایک شاعر محمد حسین صاحب خلف بہادر سنگھ تھے، وہ نو مسلم تھے اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، فارسی میں مرزا غالب کے شاگرد تھے، انھوں نے ۱۳۰۷ھ (مطابق ۱۸۸۹ء) میں وفات پائی۔[2] ان کے کلام کا نمونہ پیش ہے:

اسیر پنجۂ خورشید ماہ را دیدم گرفت دست نگاریں چو جام و مینا را

اسی زمانہ میں دوسرے دو فارسی گو شعرا کا ذکر صاحب روز روشن نے کیا ہے اور ان دونوں کا تخلص زکی لکھا ہے، میر محمد مہدی زکی بریلوی کا درج ذیل شعر روز روشن میں ملتا ہے[3]

رخ گلگونت از عشاق پوشیدہ نمی باید تو کالے می کنی یار اگر دن را نمی شاید

دوسرے زکی کے حالات دستیاب نہیں ہوتے، لیکن ان کے درج ذیل شعر روز روشن میں ملتے ہیں[4]

بیقراری را تسلی از نگاہ یار نیست زہر قاتل دارئے درد دل بیمار نیست

رود گر نفست ہوائے چمنستان از من می رود موج صبا بر زدہ داماں از من

دم عیسیٰ قلمم یافت زکی بعد کلیم زندہ شد لطف سخن باز بدوران از من

گذشتہ صدی کے اختتام سے قبل ہی ہندوستان میں فارسی زبان اور شاعری پر زوال آنا شروع ہو گیا تھا، اور اس کی جگہ رفتہ رفتہ اردو نے لے لی تھی، بریلی میں بھی حالات دوسری جگہوں سے مختلف نہ تھے اور گزشتہ صدی کے آخری زمانے سے یہاں فارسی شاعروں

[1] تاریخ فرخ آباد (مخطوطہ رامپور) صفحات ۳۸۵ - ۳۸۶ - ۳۳۵ [2] تلامذۂ غالب ص ۱۹۲
[3] روز روشن ص ۲۷۰ [4] روز روشن ص ۲۶۹

کے حالات دستیاب نہیں ہوتے، موجودہ صدی میں البتہ یہاں ایک ایسے خاندان کا پتہ چلتا ہے جس کے افراد میں فارسی گوئی کا ذوق بدستور باقی تھا، سپہر آرا خاتون پنہاں اور بلقیس جمال جمالہ اسی ذی علم خاندان کی چشم و چراغ تھیں، اور اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی ان کا کلام موجود ہے،

پنہاں ۱۹۰۶ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئیں لیکن اپنے والد مولوی عبدالاحد صاحب کے قیام الہ آباد کی وجہ سے ان کی پرورش الہ آباد میں ہوئی، انھیں شعر گوئی کا شوق ۱۹۲۱ء سے پیدا ہوا اور اس فن میں طالب علی طالب الہ آبادی کی شاگرد ہوئیں لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا، کیونکہ ۱۹۲۵ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ پنہاں کو بھی الہ آباد چھوڑنا پڑا اور وہ بریلی واپس آگئیں[1]، ان کے فارسی کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

(کذا) گفتند کہ از عشق بتاں رستہ نکوتر — گفتم کہ بر اوج تپشش رستہ نکوتر
گفتند دریں راہ خبر ہیچ نیامد — گفتم کہ زہ دانستہ نہ دانستہ نکوتر

دلا از رمز ہستی باخبر زی — ز سودائے سکوں بیگانہ تر زی

امیر خسرو کی نعت میں ایک مشہور غزل کے جواب میں لکھی ہوئی پنہاں کی ایک غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں[2]:

جمالش زینت دل بود شب جائیکہ من بودم — بچشمم دہر باطل بود شب جائے کہ من بودم
بپرس از رہبر کامل طریق عشق و الفت را — مہر تلوار منزل بود شب جائے کہ من بودم
نگاہم بر تجلائے رخ آئینہ رخسارے — سرم بر پائے قاتل بود شب جائے کہ من بودم
چساں دل محو می سازد زیادم کیف دوشینہ — دلم نخچیر قاتل بود شب جائے کہ من بودم
دلم پرداخت یا یاد جمال دوست دو با من — وجود غیر باطل بود شب جائے کہ من بودم

[1] تذکرۂ شاعرات اردو، ص ۲۰۵ [2] امیر خسرو کی اس غزل کا مطلع درج ذیل ہے
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو — محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

بلقیس جمال ۱۹۰۹ء میں بریلی میں پیدا ہوئیں لیکن عہد طفولیت الہ آباد میں بسر کیا، ۱۹۲۵ء میں وہ بھی دیگر افراد خاندان کے ساتھ بریلی واپس آئیں اور ۱۹۲۶ء میں ازدواجی زندگی میں منسلک ہوئیں، لیکن ۱۹۴۰ء میں بیوگی کا داغ اٹھانا پڑا، اپنی بڑی بہن پنہاں کی طرح وہ بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعرہ ہیں[1]، مولانا جامی کی ایک مشہور غزل کے جواب میں ان کی لکھی ہوئی ایک غزل کا شعر نمونۃً پیش ہے[2]:

چوں تماشائے دو عالم در نظر پوشیدہ — اے جہاں آرا نگاہت از حجاب آید بروں

اٹھارہویں صدی سے قبل بریلی میں کسی فارسی نثر نگار کا پتہ نہیں چلتا، اس صدی میں البتہ یہاں فارسی نثر کی کچھ کتابیں لکھی گئیں، ان میں اولیت کا شرف حافظ رحمت خاں کی تصنیف خلاصۃ الانساب کو ہے جو افغان قبائل کی ایک تاریخ ہے، جسے حافظ الملک نے علی محمد خاں کے زمانۂ حیات ہی میں لکھا تھا[3]، حافظ الملک کے انتقال کے چھ برس بعد ۱۱۹۴ھ (مطابق ۱۷۸۰ء) میں قطب علی تنہا نے شیخ نظامی کے سکندر نامہ کے پہلے حصہ کی (جو شرف نامہ یا سکندر نامۂ بری کہلاتا ہے) کی شرح لکھی، اسی زمانہ میں قدرت اللہ شوق (متوفی ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء) نے اپنی مشہور تاریخ عالم جام جہاں نما (سال ابتدا ۱۷۷۵ء سال اختتام ۱۷۸۵ء) مکمل کی اور اس کے دس سال کے بعد یعنی ۱۷۹۶ء میں انھوں نے اپنا اردو شاعروں کا تذکرہ طبقات الشعرا مکمل کیا، شوق کی ایک تیسری تصنیف تکملۃ الشعراء ہے، جو حقیقۃً جام جہاں نما کا شعرائے فارسی سے متعلق حصہ ہے جو ۱۸۰۴ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا[4]، اسی دور کی ایک دوسری کتاب گلستان رحمت ہے، جو شمالی ہند میں روہیلہ دور حکومت، خصوصاً حافظ رحمت خاں کے

[1] تذکرۂ شاعرات اردو، ص ۱۰۳ [2] جامی کی اس غزل کا مطلع درج ذیل ہے
ایں قدر مستم کہ از چشمم شراب آید بروں — وز دل پر حسرتم بوئے کباب آید بروں
قافیہ کے تغیر کے ساتھ اسی طرح میں اقبال کی غزل بھی موجود ہے جس کا ایک شعر درج ذیل ہے
عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات — تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں
[3] Persian Literature by C.A. Storey, Section II Fasciculus I P.143 and Vo I. Part II P.877 [4] Hastings and The Rohilla War, P.13

حالات میں قدیم ترین اور مستند ترین کتاب ہے، جسے حافظ رحمت خاں کے بیٹے محمد مستجاب خاں (متوفی ۲ر شوال ۱۲۴۸ھ مطابق ۲۲ر فروری ۱۸۳۳ء) نے ۱۷۹۳ء میں مکمل کیا۔[۱] اسی زمانہ میں حافظ رحمت خاں کے دوسرے بیٹے الہ یار خاں نے ہندوستانی پشتو لغت مرتب کیا جس میں معنی فارسی زبان میں سمجھائے گئے تھے،[۲]

انیسویں صدی میں بریلی میں ہونے والی فارسی تصانیف میں اولیت کا شرف قدرت اللہ شوق کی تصنیف تکملۃ الشعراء کو ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس دور کی ایک دوسری تصنیف عطر بہار ہے، جو حقیقتاً جہاندار شاہ کے عشق سے متعلق شیخ عنایت اللہ کی تصنیف بہار دانش کی سہل فارسی عبارت آرائی ہے، اس کتاب کو محمد نذیر الدین حسن شائق ابن شاہ غلام محی الدین سرہندی، متوطن بلدۂ بریلی نے ۱۲۲۲ھ (مطابق ۱۸۰۷ء) میں تصنیف کیا جیسا کہ درج ذیل شعر سے ظاہر ہے[۳]

بہار بخش دل دانش شعار گفتہ "زیبا نسخۂ عطر بہار"

تذکرۃ الشعراء، خلاصۃ العلوم، مفتاح جیبان، بدیع التجارب، بدیع النور وغیرہ متعدد کتابیں (جن میں آخر الذکر دونوں فن طب سے متعلق ہیں)، اسی دور میں مولانا رحم علی بریلوی نے تصنیف کیں[۴] اور ۱۲۲۸ھ (مطابق ۱۸۱۳ء) میں بریلی کے ایک دوسرے حکیم غلام امام نے فن طب پر ایک اور کتاب مصباح المجربات تصنیف کی جس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے، ۱۲۳۸ھ (مطابق ۱۸۲۳ء) میں حافظ رحمت خاں کے ایک پوتے مودت خاں خلف حافظ بابر خاں بن حافظ رحمت خاں نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

۱؎ اخبار حسن ۲؎ Persian leterture, Section II Fasciclus VII P.696
۵؎ Hasting and Rohila war. Page 28
۳؎ عطر بہار، مخطوطہ رامپور، عمدۂ منتخبہ ص ۳۸۲ ۴؎ تاریخ فرخ آباد مصنفہ سید ولی اللہ ص ۳۶۶

پر تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب اسعد الاخبار بذکر سید الابرار تصنیف کی[۱] اور اس کے چند سال بعد یعنی ۱۲۴۹ھ (مطابق ۱۸۳۳ء) میں حافظ رحمت خاں کے ایک اور پوتے سعادت یار خاں بن حافظ محمد یار خاں نے روہیلہ افغانوں سے متعلق ایک دوسری اہم تصنیف گل رحمت (جو حقیقتاً مستجاب خاں کی گلستان رحمت پر مبنی ہے) مکمل کی،[۲] اسی زمانہ میں کندن لال اشکی نے نزہت الناظرین تصنیف کی اور ان کے بیٹے منولال فلسفی نے جغرافیہ پر ایک کتاب مساکن فلسفی لکھی جس کا ایک قلمی نسخہ رامپور میں موجود ہے، فلسفی شاعر بھی تھے، اور تذکرہ روز روشن میں ان کا درج ذیل شعر ملتا ہے[۳]

آں زلف گرہ گیر کہ جانم گرو اوست گسترده برائے کردگر دام بلا را

(باقی)

۱؎ تذکرۂ جواہر زواہر حصہ اول ص ۱۲۰ ۲؎ گل رحمت مخطوطہ رامپور، ورق ۱ (الف) - Persian
Literature by, C.A.Sterey, P.697 ۳؎ روز روشن، ص ۵۳۸

میرا وارڈ

اس سال میرا وارڈ کی رقم ہزار سے بڑھا کر ساڑھے بارہ سو روپیے کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ میر تقی میر سے متعلق ۱۹۶۶ء کی بہترین تصنیف پر ایک طلائی تمغہ بھی دیا جائے گا۔

میرا وارڈ ۱۹۶۶ء کی چھپی ہوئی اردو کی بہترین علمی، ادبی، تاریخی، تحقیقی تصنیف اور شعری مجموعے پر دیا جائے گا، جس کا فیصلہ ایک کمیٹی کرے گی۔ انعام میں شامل کیجانے والی کتاب کی پانچ جلدیں ۱۵ر مارچ ۱۹۶۷ء تک جنرل سکریٹری کے پتے پر پہنچ جانی چاہئیں۔

مظفر احمد لاری جنرل سکریٹری آل انڈیا میرا کاڈمی
لاری ہاؤس۔ لکھنؤ۔

شام میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء

از جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے پی ایچ ڈی (علیگ) لکچرر شعبۂ عربی وینکٹیشور یونیورسٹی آندھرا

(۲)

قسطاکی الحمصی ۱۸۵۸ء - ۱۹۴۱ء

قسطاکی الحمصی حلب میں ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوا، اس کے والد خوشحال اور مشہور ومعروف اعیانِ حلب میں تھے، ان کی تجارت بہت وسیع تھی، حمصی نے پہلے ایک مکتب میں پڑھا، پھر "رہبان ار فرانسیس" کی تعلیم گاہ میں داخل ہوگئے اور فرانسیسی واطالوی زبانوں میں مہارت حاصل کی، ۱۸۷۵ء میں فرانس کا سفر کیا اور ایک فرانسیسی پروفیسر سے فلسفہ کا درس لیا، ۱۹۱۳ء میں دوبارہ فرانس گئے، اس طرح فرانسیسی زبان میں ان کو عربی ہی کی طرح مہارت حاصل ہوگئی،

حمصی کو بچپن ہی سے شعروادب کا ذوق تھا، شیخ ابراہیم یازجی سے ان کے قریبی تعلقات تھے، ۱۸۹۵ء میں انھوں نے استنبول اور ۱۹۰۵ء میں قاہرہ کا سفر کیا، اور اہل فکر ونظر سے مل کر ذہن میں جلا پیدا کی،

زبان کی صحت کا ان کو بڑا خیال تھا، ان کے ترجموں تک میں غیر عربی طرز کا پتہ نہیں چلتا، ۱۹۱۹ء میں ان کو "المجمع العلمی العربی" نے اپنا ممبر منتخب کیا،

(۱) انھوں نے ایک کتاب "منہل الوراد" کے نام سے دو جلدوں میں لکھی، پھر بعد میں تیسری جلد کا اضافہ کیا، جس میں دانتے اور ابوالعلاء المعری کا تقابلی مطالعہ شامل ہے، یہ دورِ جدید کی

عربی میں تنقید پر پہلی کتاب ہے

(۲) "ادباء حلب ذوو الاثر فی القرن التاسع عشر"

(۳) "مختارات من شعرہ"

(۴) ان کتابوں کے علاوہ ان کے محاضرات، مقالات اور رسائل کے مجموعے کئی ضخیم جلدوں میں ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں،

۱۹۲۰ء میں لبنان کے ایک طبقہ نے نعرہ لگایا کہ فرانسیسی کو ملک کی سرکاری زبان بنا دیا جائے، اس کی ملک کے اہل نظر نے مخالفت کی، مخالفت کرنے والوں میں قسطاکی الحمصی بھی تھے، انھوں نے ایک قصیدہ میں عربوں کی فضیلت ومفاخر بیان کرکے اس خیال کی مذمت کی ہے، اس قصیدہ کا نام "البدویہ" ہے،

فان لیلی فتاۃ ما مثیل لها ‏ ‏ ‏ صیغت من الحسن شکلاً ماله ثان

بیشک لیلی ایسی نوجوان لڑکی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں، وہ بے مثال حسن کے سانچے میں ڈھالی گئی ہے

اس لیلی سے مراد عربی زبان ہے،

حروفها لمعان لا نظار لها ‏ ‏ ‏ فی حسنها بنت یونان ورومان

اس کے حروف روشن ہیں، یونانی اور رومانی لڑکیاں (زبانیں) اسکے حسن کا مقابلہ نہیں کرسکتیں،

ہارون الرشید کے پرشوکت دور کے بارہ میں کہتا ہے

الارض فی ظلمة للجهل حالكة ‏ ‏ ‏ وملكه مشرق من نور عرفان

زمین پر جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر ہارون الرشید کا ملک نور عرفان سے روشن تھا

فرانسیسی کو سرکاری زبان بنانے کی کوشش اسلاف کی توہین ہے،

انکرتموا الیوم ناصفاً واسرته ‏ ‏ ‏ نبشتم قبر شدیاق وبستانی

آج تم نے ناصف یازجی اور اس کے خاندان کی توہین کی اور احمد فارس شدیاق اور بطرس بستانی کی قبر کھودی ہے

اما سمعتم ابا اسحاق ینشدکم   یا بعض لبنان قد مزقت اکفانی

کیا تم نے نہیں سنا کہ ابراہیم ابو اسحاق (یازجی) کہتے ہیں کہ بعض لبنانیوں نے میرا کفن پھاڑ ڈالا۔

پھر کہتا ہے کہ عربی زبان کے حامی اس کی حفاظت کریں گے۔

لیلاک آمنة مادام من رهنوا   عهودهم عندنا من خیر اعوان

تیری لیلی (عربی زبان) مامون ہے جب تک اس کے بہترین مددگار و حامی موجود ہیں۔

محمد البزم ۱۸۸۶ء ۱۹۵۵ء

محمد بزم ۱۸۸۶ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، ان کے والد تجارت کرتے تھے، بزم بیس سال کی عمر تک سوا شد بد کے کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے، پھر تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا، اور وہ اہل علم کے حلقوں میں جانے لگے اور دمشق کے علماء سے انھوں نے پورا استفادہ کیا اور بڑے انہماک کے ساتھ مطالعہ میں مشغول ہو گئے، آخر میں مدرس ہو گئے اور ۲۰ برس تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی،

۱۹۴۲ء میں المجمع العلمی العربی کے رکن منتخب ہوئے، آخر میں بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی سال کی علالت کے بعد جولائی ۱۹۵۵ء میں انتقال کیا،

شاعری

مصر میں عرب شعراء نے الفاظ کے مقابلہ میں معانی کی اہمیت پر زور دیا، مگر بعض شعراء نے الفاظ کی جانب سے بے توجہی برتی، بلکہ بالکل جدید مغربیت زدہ شاعروں نے تو زبان ہیئت کی اہمیت ہی سے صرف نظر کر لیا، اس کے رد عمل میں شام کے شعراء میں حسن الفاظ اور حسن ترکیب کی جانب رجحان بڑھا، چنانچہ محمد بزم، جبری، خلیل مردم اور زرکلی نے بھی حسن الفاظ کا خاص طور سے لحاظ رکھا، لیکن معنوی حیثیت سے بھی ان شعراء کی راہ بارودی، شوقی اور حافظ سے مختلف نہ تھی، ان کا بنیادی خیال یہ تھا کہ (۱) صیاغت الفاظ کو اولیت حاصل ہو

(۲) فکر کا مسئلہ اس کے بعد کی چیز ہے (۳) مغرب و مشرق کی ثقافت بنیادی طور پر متباین ہیں،

محمد بزم خیالات کے لحاظ سے جاہلی اور جذبات کے لحاظ سے بدوی ہیں، ان کے یہاں بدویانہ طرز کی سادگی، حلاوت اور سچائی ملتی ہے، حسن تعبیر کے جلوے جابجا نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ جاہلی شعراء کی غرابت الفاظ بھی کثرت سے نظر آتی ہے، ان کی تراکیب اور تلمیحات بھی جاہلی طرز کی ہوتی ہیں، رزمیہ شاعری میں ان کا کلام دور جدید میں شاعرانہ قوت و عظمت کا نشان ہے،

شاعری ان کے لیے محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ گذارش احوال واقعی ہے اور زندگی سے حقیقی تعلق کے ساتھ ساتھ فن کی عظمت، الفاظ پر قدرت اور معانی کی فراوانی ملتی ہے، زمانہ کے مصائب، زندگی کی پریشانیوں اور حالات کی نامساعدت کے بیان میں انھیں ید طولی حاصل ہے، نمونۃً چند اشعار ملاحظہ ہوں،

دع الدهر تنمو بالرزایا مصائبه   وتمطر اصناف البلایا سحائبه

زمانہ کے مصائب کو بڑھنے دو اور طرح طرح کی بلاؤں کے بادلوں کو برسنے دو

فما الدهر الا مر یوم ولیلة   تروح بسعد او بنحس کواکبه

زمانہ کیا ہے؟ دن رات کا گزرنا، اس کے کواکب سعد و نحس کو لیکر گردش کرتے ہیں۔

تطاردنا خیل الزمان بلادنی   ویعدو علینا صرفه ونوائبه

زمانہ کے گھوڑے ہمارے ملک کو پامال کر رہے ہیں، ہم پر زمانہ کی گردش اور اس کے مصائب ٹوٹ پڑتے ہیں۔

اہل مغرب کی غداریوں کا ذکر کر کے کہتے ہیں

ولا تیأسوا ان اظهر الغرب غدره   نادمت بنانی النائبات مخالبه

اگر مغرب نے غداری کی اور اس کے پنجوں نے مصائب میں ہمارا خون نکال لیا تو مایوس نہ ہو،

فغینا وان طال المدی وعدا لردی بقیۃ عزم لم تنبہ ھا نوائبہ

اگرچہ ہم پر اس کی مدت طویل ہوگئی ہے اور ہلاکت آگئی ہے لیکن مصائب کے اس ہجوم نے ہمارے عزم کو متزلزل نہیں کیا ہے

فھبوا ھبوب اللیث للمجد وانتضوا من الحزم عضبا لاتفل مضاربہ

اپنی عظمت و بڑائی کیلیے شیر کی طرح اٹھ کھڑے ہو اور عزم محکم کی ایسی تلوار لیکر اٹھو جسکی دھار بھرپور ہو،

اقومی! لاترضوا بالمذلۃ منزلاً تمشی الیکم بالسموم عقاربہ

اے میری قوم! ذلت کی منزل پر راضی نہ ہو، تیری طرف بچھو زہریلے ڈنک کے ساتھ بڑھ رہے ہیں،

ان اشعار میں بزم نے عربوں کے عزم و ہمت کو للکارا ہے، اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کا سبق دیا ہے اور حسن بیان کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے،

خیرالدین زرکلی

جس طرح مصر میں حافظ، شوقی اور مطران نے عربی شاعری کے خوابیدہ جادو کو جگایا اسی طرح شام میں خیرالدین زرکلی، محمد بزم، شفیق جبری اور خلیل مردم نے جدید عربی شاعری میں جدت، بلندی اور تابندگی کی نئی روح پھونکی اور اس کو ایک نیا آہنگ دیا، مذکورہٴ بالا شعرا نے جدید رنگ میں امتیازی شان پیدا کی اور اس کے ذریعہ قومی زندگی کے احیاء اور قوم میں جولانی و نشاط پیدا کرنے کی کوشش کی،

خیرالدین زرکلی ۱۸۹۳ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے بیروت گئے۔ ان کی ذہنی تربیت میں مشہور ادیب کرد علی، شیخ عبدالقادر اور جمال الدین قاسمی کے افکار اور ان کے درس کو بڑا دخل تھا، جن سے زرکلی نے کسب فیض کیا تھا،

۱۹۱۸ء میں جب امیر فیصل کی قیادت میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی اور عربی زبان کا عام رواج ہوا[1] تو زرکلی نے تیس سال کی عمر میں ایک رسالہ "المفید" کے نام سے نکالا

[1] اس سے پہلے سرکاری زبان ترکی تھی،

اس نے عربوں میں قومیت اور اپنی انفرادیت کا احساس پیدا کیا، اس دن جب فرانسیسی امیر فیصل کا تخت الٹنے کے لیے دمشق میں داخل ہو رہے تھے، زرکلی مصر کے ارادہ سے فلسطین چلے گئے، پھر وہاں سے مصر روانہ ہوگئے، مصر سے حجاز گئے، ان کی عدم موجودگی میں جون ۱۹۲۰ء میں فوجی عدالت نے بہت سے سیاسی افراد کے لیے پھانسی کا حکم جاری کیا، ان میں زرکلی کا نام سرفہرست تھا، جب یہ خبر ان کو ملی تو مسکرائے اور یہ اشعار کہے:

نذروا دمی حقاً علی وفاتھم ان الشقی بما لقیت سعید

انھوں نے میرے خون کی منت مانی ہے لیکن اسکو پا نہ سکے، جو کچھ مجھے ملا ہے اگر وہ کسی بدبخت کو مل جائے تو وہ خوش نصیب ہے.

اللہ شاء لی الحیاۃ وحاولوا مالم یشاء، ولحکمہ التائید

خدا کو میری زندگی منظور تھی، انھوں نے اسکے خلاف چاہا، لیکن خدا ہی کا فیصلہ ناطق رہا،

زرکلی حجاز سے عمان چلے گئے، یہاں وہ فرانسیسی سامراج کے خلاف پرزور قصائد اور نظمیں لکھتے رہے، عمان میں وہ پہلے مجلس المعارف کے رکن مقرر ہوئے، پھر حکومت میں ایک اہم عہدہ مل گیا، اسی عرصہ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہوگئی، اور زرکلی پھر مصر واپس ہونے پر مجبور ہوگئے.

مصر کی جلاوطنی کے زمانہ میں انھوں نے ایک اہم علمی خدمت انجام دی اور برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد انھوں نے عربی کے عرب و غیر عرب مصنفین و اہل قلم کے حالات میں کئی جلدوں میں ایک کتاب لکھی، جو ۱۹۲۷ء میں "الاعلام" کے نام سے چھپ گئی ہے، اس نے علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت اور اہمیت حاصل کی اور حوالہ کی بنیادی کتابوں میں سمجھی جاتی ہے،

انھوں نے مصر سے لوٹ کر ایک رسالہ "الحیاۃ" کے نام سے جاری کیا جس میں انگریزوں اور فرانسیسی حکومت پر سخت تنقیدیں کیں، ۱۹۳۲ء میں شاہ سعود کی حکومت میں ان کو بعض معزز عہدے حاصل ہوئے،

۱۹۲۵ء میں ان کا دیوان "دیوان خیر الدین زرکلی" کے نام سے شائع ہوا جس میں وطن سے دوری، درد والم اور شوق وحسرت کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے،

نثر میں "الاعلام" کے علاوہ "عامان فی عمان" اور "ما رأیت وما سمعت" ان کی تصانیف ہیں،

شاعری: ان کے اشعار میں تین نمایاں خصوصیات ہیں، پہلی خصوصیت یہ ہے کہ زرکلی نے شعرائے متقدمین کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اس لیے اس کا اثر ان کے کلام میں نمایاں ہے، اس نے کلام میں متانت، پختگی اور بلندی پیدا کردی، قدماء سے استفادہ کے باوجود زرکلی کے خیالات اور طرز اسلوب میں ان کی انفرادیت بھی قائم ہے،

وہ بڑی محنت و ریاضت سے شعر کہتے ہیں، اور مسلسل حک و اصلاح کے بعد اس کو حسین پیکر میں پیش کرتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پچاس شعر کہتے ہیں، پھر کاٹ چھانٹ کے بعد صرف آٹھ دس شعر باقی رہ جاتے ہیں، جو اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہوتے ہیں[1]

دوسری خصوصیت وطنیت وقومیت کا عنصر ہے، اگرچہ حافظ وشوقی نے بھی یہی نغمہ گایا تھا، مگر اس حیثیت سے شامی شعراء میں زرکلی کا درجہ بہت بلند ہے کہ انھوں نے اپنے وطن اور عرب قوم سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے، تیسری خصوصیت سیاسی واجتماعی مسائل کا بیان ہے، انھوں نے بہت سے قصیدوں میں فرانس کے خلاف اپنی زبان وقلم کے جوہر

[1] مجلۃ المجمع العلمی العربی المجلد ۵ ص ۵۰۵ بحوالہ الادب العربی المعاصر فی مصر

دکھائے ہیں، ان اشعار میں وطن سے محبت اور شام سے والہانہ تعلق کا جذبہ جھلکتا ہے،

العین بعد فراقھا الوطنا — لا ساکنا ألفت ولا سکنا

وطن سے فراق کے بعد آنکھ مضطرب و بے قرار ہے،

کانت تری فی کل سانحۃ — حسناً فباتت لا تری حسنا

پہلے ہر واقعہ میں حسن کا پہلو دیکھتی تھی مگر اب اس کو کسی چیز میں حسن نظر نہیں آتا،

ما کنت احسبنی مفارقھم — حتی تفارق روحی البدنا

میں اہل وطن کے فراق کا تصور نہیں کرسکتا تھا جب تک روح بدن میں باقی ہے،

عطفوا علیک فاوسعوک اذی — وھم یسمون الاذی مننا

اہل مغرب تجھ پر مہربان ہوئے تو مصائب سے نوازا اور مصیبتوں کا نام منن رکھا،

نظم کے آخر میں کہتا ہے،

لی ذکریات فی ربوعھم — ھن الحیاۃ تألقا وسنی

شام کے سبزہ زاروں میں میری حسین وخوش آیند یادوں کے گلدستے ہیں،

ان الغریب معذب ابداً — ان حل لم ینعم وان ظعنا

مسافر عذاب میں مبتلا ہے خواہ قیام کرے یا سفر کرے،

لو مثلوا لی موطنی وثنا — لھممت اعبد ذلک الوثنا

اگر لوگ بت بنا کر وطن کو میرے سامنے پیش کرتے تو میں اس کے پوجنے کا عزم کرتا

ایک دوسری نظم "سوریۃ الشھیدۃ" (شام شہید) میں کہتا ہے:

ان الدم المھراق فی جنباتھا — لدمی وان شعارھا لشعاری

اس کے پہلوؤں میں بہایا ہوا خون میرا خون ہے اور اسکی جز کا شا میری جز کا شا ہے

صبرت دمشق علی النکال لیالیا   حرم الرقاد بها علی الاشفار

دمشق نے مصیبت کی کتنی راتیں صبر سے بسر کیں اور مصائب میں کتنی راتیں عالم بیداری میں گذاریں

لهفی علی المتخلفین بر حبها   کیف القرار ولات حین قرار

افسوس ہے وہاں باقی رہ جانے والوں پر وہاں کیسے قرار آتا ہے جہاں قرار نہیں۔

یترقبون الموت فی غدواتهم   واذا نجوا فالموت فی الاسحار

صبح کو موت کا انتظار کرتے ہیں، اگر بچ گئے تو شام کو موت دھری ہے۔

ان اشعار میں وطن کی حمیت کے ساتھ اہل فرانس کے ظلم وستم اور اہل شام کے رنج وغم کی داستان بھی بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

الوابل المدرار من حمم اللظی   متواصل کالوابل المدرار

آگ وشعلے اس طرح مسلسل برس رہے ہیں جیسے موسلا دھار بارش

ویح الحضارة کیف یمتهن اسمها   متکالبون علی الضعاف ضواری

غارت ہو تہذیب! اس نام کو کس طرح ذلیل کر رہے ہیں (اہل فرانس) کمزوروں پر کتوں کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں۔

أرأیت کیف طغی الفرنج وادغوا   صدر الأسنة ایما ایغار

تم نے دیکھا کہ اہل فرانس نے کیا ستم کیا، جان پایا نیزہ کی انی سختی سے چبھو دی

واستهدفوا الاطفال فی حجراتها   والمطفلات وهن فی الاخدار

انھوں نے بچوں کو انکی ماؤں کی گود میں نشانہ بنایا اور وہ پردہ نشین کمزور ہیں،

خلیل مردم بک خلیل مردم ۱۸۹۵ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر میں اسکول جانا شروع کیا، ابتدائے عمر ہی سے شاعری سے دلچسپی تھی، اسی زمانہ سے انھوں نے اشعار

موزوں کرنا ...... شروع کر دیے تھے، مختلف مدرسوں میں تعلیم حاصل کی، ۱۹۱۸ء میں جب ترکوں کا اقتدار شام سے ختم ہوا، اور عربی حکومت قائم ہوئی تو خلیل مردم کو ایک ملازمت مل گئی، ۱۹۱۹ء میں جب حکومت کے ملازموں کے لیے "مدرسۃ الکتاب والمنشئین" قائم کیا گیا، تو اس میں خلیل مردم بک مدرس مقرر ہو گئے، ۱۹۲۱ء میں "جمعیۃ الرابطۃ الادبیہ" کی تاسیس ہوئی اور خلیل مردم اس کے صدر منتخب ہوئے، تو مجلہ رابطہ ادبیہ کے مدیر بھی قرار پائے، فرانسیسیوں کے قبضہ کے بعد انھوں نے اس جمعیۃ کو توڑ دیا، اس لیے ان کی یہ حیثیت بھی ختم ہو گئی،

۱۹۵۲ء میں انھیں "المجمع العلمی العربی" کا رکن بنایا گیا،

دمشق میں تھوڑی بہت انگریزی سیکھی تھی، پھر ۱۹۲۶ء میں لندن یونیورسٹی میں انگریزی زبان وادب کی تحصیل کی، اور وہاں تین سال قیام کیا،

۱۹۲۹ء میں "کلیہ علمیہ وطنیہ" میں لیکچرر ہو گئے اور سات سال اسی خدمت پر مامور رہے، اسی اثنا میں "ائمۃ الادب العربی" کے نام سے ایک سلسلۂ تصنیف شروع کیا، جس کے پانچ اجزاء شائع ہوئے، یعنی جاحظ، ابن مقفع، ابن العمید، صاحب بن عباد اور فرزدق، ۱۹۳۲ء میں بعض ادباء کے تعاون سے مجلہ ثقافت جاری کیا جو دس سال تک نکلتا رہا،

۱۹۴۲ء میں وزیر تعلیم ہوئے، پھر ۱۹۴۹ء میں وزیر صحت و تعلیم کی حیثیت سے سیاسی زندگی میں قدم رکھا، ۱۹۵۲ء میں پھر وزیر تعلیم ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں المجمع العلمی العربی کے صدر منتخب کیے گئے۔

شاعری خلیل مردم بک بحیثیت شاعر کے ایک مخصوص اسلوب کے مالک ہیں، انکے بیان معانی کا ایک دریا نظر آتا ہے، جس کے کناروں کا پتہ نہیں، اجتماعی زندگی کے مسائل

اور سیاسی کوائف و حالات ان کی شاعری کا نمایاں عنصر ہیں، رزمیہ شاعری کے علاوہ بزمیہ شاعری میں بھی انھیں امتیاز حاصل ہے، انھوں نے وصف نگاری اور اشیاء کی تصویر کشی میں غیر معمولی شاعرانہ قدرت کا ثبوت دیا ہے، ان کی شاعری میں تخیل کی کمی اور حقائق و واقعات کی کثرت ہے، تخیل کا سہارا وہ اسی وقت لیتے ہیں جب وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت کے کھلے ہوئے اظہار سے حکومت کی گرفت کا خطرہ ہے، اس وقت وہ تخیل و استعارے کے ذریعے اپنا مفہوم ادا کرتے ہیں،

نمونۂ ان کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں انھوں نے اہل شام کو مخاطب کیا ہے،

یالیت شعری ماذا یستفز کم | حمی مباح واذلال وافقار
کاش میں جانتا کہ کونسی چیز تم کو بیدار کرے گی، قابل حفاظت و احترام چیز مباح ہو گئی ہے اور فقر و ذلت طاری ہے،

اھی الحجارۃ احمی من انو فکم | کم ار سلت شررا بالقدح احجار
تم سے زیادہ غیرت مند پتھر ہیں جن کو ضرب لگانے سے شعلے نکلتے ہیں،

اخوانکم فی فلسطین تنالھم | بالسوء والعسف انیاب واظفار
تمھارے بھائی فلسطین میں ظالموں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں،

شفیق جبری | شفیق جبری کے والد دمشق کے دولت مند تاجر تھے، ۱۸۹۸ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، قرآن مجید کا کچھ حصہ پڑھا تھا کہ ان کے والد کے ایک عیسائی دوست نے ان کو فرانسیسی مدرسہ میں داخل کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ ایک جدید فرانسیسی مدرسہ میں ان کا داخلہ ہو گیا، اور انھوں نے سات برس تک وہاں ثانوی تعلیم حاصل کی، اور فرانسیسی لکھنے پر ان کو پوری قدرت حاصل ہو گئی، اس کے بعد انھوں نے عربی ادب کی اہم کتابوں کا مطالعہ کر کے

عربی کی استعداد بڑھائی اور عربی تحریر کی مشق پیدا کی،

۱۹۳۰ء میں جب وزارت تعلیم نے دمشق میں یونیورسٹی قائم کی تو شفیق جبری اس کے وائس چانسلر مقرر کیے گئے،

ان کی تصانیف میں "البحر والصحرا"، "العوامل النفسیہ فی سیاسۃ العرب" اور "ابوالفرج الاصبہانی" شائع ہو چکی ہیں، "محمد کرد علی" "المتنبی" اور "الجاحظ" ان کے مشہور محاضرات ہیں، "انا والشعر" اور "انا والنثر" وغیرہ بھی ان کی اہم تصانیف ہیں،

شاعری | شفیق جبری بہت کم کہتے ہیں، لیکن جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ ان کے دل کی آواز، ان کے سماج کی پکار اور ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے، ہر غم کو وہ غم روزگار بنا دیتے ہیں، انکی شاعری میں بڑی وسعت و عظمت ہے، اور اس میں سیاست و اجتماعیت اور زندگی کے حقایق کا بیان پوری قوت و قدرت کے ساتھ موجود ہے، انھوں نے وطن کی روح، اس کے جذبات اور تمناؤں کی تاریخ اور سیاسی کشمکش کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے،

عربوں کو شاندار مستقبل کی دعوت کے لیے انھیں ماضی کے سنہرے اوراق کی طرف لے جاتے ہیں اور قرون اولیٰ کے ان مسلمانوں کا نقشہ کھینچتے ہیں جنھوں نے اسلام کا پیام بحر و بر کے گوشے گوشے تک پہنچایا، اپنی علم دوستی سے علم و حکمت کے گوہر لٹائے، اپنی زندگی سے عمل کا جادو جگایا، اور دلوں کی ویران بستی کو آباد کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا کردہ عظیم انقلاب کو انھوں نے بڑے سلیقے سے ایک قصیدہ "صیحۃ النبی" میں پیش کیا ہے، اور اس کا رشتہ حال سے ملایا ہے، اس قصیدہ کے دو بند ملاحظہ ہوں:

لسرعان ما جلی الیقین ارتیابھم | فھشوا الی طیب من الوحی فائح
بہت جلد یقین نے ان کے شک کو دور کر دیا اور وہ پاکیزہ وحی سے مسرور ہوئے۔

مشی الوحی فیھم مشیة البرء فی الضنی ۔ فأی فتی من سحرہ غیر طافح

ان میں وحی کا اثر اس تیزی سے ہوا جیسے صحت بیمار کو اچھا کرتی ہے، کوئی نوجوان کے
اس سحر سے محروم نہ رہا،

فطاروا الی الدنیا بدین محمد ۔ وقد فتحوا الدنیا کلمحة لامح

وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین لیکر دنیا کی طرف بڑھے اور اس کو پلک جھپکتے فتح کرلیا۔

فما عاقت الصحراء علی طی رملھا ۔ ولا ردت الامواج خوض الجحاجح

صحراؤں نے ریگستان کی کثرت کے باوجود انکی راہ نہ روکی اور نہ موجیں ان کو سمندر کی انتہا تک پہنچنے
سے روک سکیں۔

ففی کل بر منھم زحف زاحف ۔ وفی کل یم منھم سبح سابح

اور بحر و بر میں وہ رواں دواں ہو گئے۔

اقبال نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے ۔ بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

فما الموت فی الایمان مر فرقة ۔ ولا الحتف فی الاسلام صعب الجوانح

ایمان کی راہ میں موت میں کوئی تلخی نہ تھی اور اسلام کیلئے مرنا آسان معلوم ہوتا تھا۔

فقادوا علی ارماحھم کل صعب ۔ وراضوا علی اسیافھم کل جامح

اپنے نیزوں سے ہر مشکل کو قابو میں اور ہر باغی کو تلوار سے راضی کرلیا۔

فلا قیصر یزھو علی الشام تاجه ۔ ولا تاج کسری کالنجوم اللوامح

نہ قیصر کا تاج شام میں ضو فشاں رہا اور نہ کسریٰ کا ستاروں جیسا چمکدار
تاج ہی باقی رہا۔

تناثرت التیجان تحت خیولھم ۔ واھوی الی اقدامھم کل طامح

سارے تاج انکے گھوڑوں کی ٹاپوں میں ٹوٹ کر بکھر گئے اور تمام سرکش انکے قدموں پر گر پڑے۔

فاین رسول اللہ ﷺ امة ۔ تئن انین الطیر من کل ذابح

حضور کہاں ہیں کہ آج امت کا حال دیکھتے کہ وہ ذبح ہونے والی چڑیا کی طرح آہ و زاری کرتی ہے

تعالت فطاحت فاستکانت فاصبحت ۔ لاذلالھا یلھو بھا کل مازح

یہ امت سربلند ہوئی، پھر کمزور ہو کر ہلاکت کے قریب پہنچی حتی کہ ہر شخص اس کو ذلیل کرنے اور اس کا
مذاق اڑانے لگا۔

فلا ملکھا فی ارض مستتبة العری ۔ ولا عیشھا فی الخلق عیش الصحائح

نہ اس کا ملک مستحکم اور محفوظ رہ گیا اور نہ دنیا میں اس کو عیش و فراغت کی زندگی حاصل ہے

علی مثلھا من ذلة بعد عزة ۔ تفیض جفون بالدموع السوافح

عزت کے بعد ایسی ذلت پر آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔

فھذی فلسطین تنوح من الاذی ۔ فما نضبت عنھا عیون النوائح

یہ فلسطین ہے جو اپنی مصیبت پر آہ و زاری کر رہا ہے اور نوحہ خوانوں کی آنکھیں اس کی
حالت پر خشک نہیں ہوتیں۔

فھل صیحة فی العرب تبعث ملکھم ۔ الا ربما ھبوا بصیحة صائح

عرب میں کوئی ایسی آواز ہے جو ان کے ملک کو پھر زندگی بخش سکے، اگر ایسا بھی ہوا ہے کہ
سونے والے ایک آواز سے جاگ گئے ہیں،

ان اشعار سے جبری کے بلند خیالات اور مذہبی جذبات کے ساتھ ان کی قادر الکلامی
کا بھی اندازہ ہوتا ہے،

"سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کا شعری او ادبی ذوق"

از جناب محمد شکیل احمد صدیقی صاحب ایم، اے، شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہے، وہ صوفیائے کرام جنکی پیدائش کا فخر ہندوستان کی سرزمین کو حاصل ہے، ان میں سلطان المشائخ کا درجہ نہایت بلند ہے آپ کی بزرگی، عبادت و ریاضت، زہد و اتقا کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، مگر آپ کی زندگی کا ایک پہلو ابھی تک تشنۂ تحریر ہے،

عام طور پر خیال کیا جاسکتا ہے کہ...... ایسے بزرگوں کو جن کا سارا وقت یادالٰہی میں صرف ہوتا ہو جن کی پیشانی دن رات معبود حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہتی ہو، شعروادب سے کیا سروکار ہو سکتا ہے، لیکن حقیقۃً ایسا نہیں ہے،

فارسی ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شعروشاعری کی ترقی میں صوفیائے کرام کا بہت بڑا حصہ رہا ہے، بلکہ انہی نے فارسی شاعری کے قالب بے جان میں روح پھونکی، سلطان ابوسعید ابوالخیر، حکیم سنائی، خواجہ فریدالدین عطار، مولانا روم اور شیخ سعدی کی خدمات قیامت تک فراموش نہیں کیجا سکتیں، فارسی ادب ہمیشہ ان بزرگوں کا ممنون احسان رہے گا،

حضرت سلطان المشائخ کو مبدأ فیاض کی طرف سے گوناگوں صفات ودیعت ہوئی تھیں، اور آپ میں بڑی جامعیت تھی، منجملہ اور اوصاف کے ایک وصف یہ بھی تھا کہ آپ کو شعروادب سے بھی تعلق تھا، اور آپ نہایت بلند ادبی ذوق رکھتے تھے، اگرچہ باقاعدہ شعر تو نہیں کہتے تھے

اس کا وقت ہی آپ کے پاس کہاں تھا، لیکن گفتگو کے دوران میں آپ کی زبان حقائق ترجمان پر بہت سے اشعار برجستہ آجاتے تھے، کبھی یہ اشعار دوسرے اساتذہ کے ہوتے اور کبھی خود آپکے، آپکے ادبی ذوق کا یہ بھی ثبوت ہے کہ آپکے دامن فیض سے خسرو اور حسن جیسے باکمال شعراء وابستہ تھے، میرا خیال ہے کہ امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی نے شعروسخن میں جو شہرت حاصل کی وہ آپ ہی کا فیضان تھا، روحانی فیض سے قطع نظر، اس میں اُس حوصلہ افزائی کو بھی دخل ہے جو وقتاً فوقتاً ان دونوں شعراء کی فرماتے تھے، یہ دونوں تو آپ کے مریدین باختصاص میں تھے، جن کو آپ سے زیادہ تقرب حاصل تھا، بلکہ ان کو آپ کی شمع جمال کے پروانے کہنا زیادہ مناسب ہوگا، آپ نے ان کو شاعری سے روکا نہیں بلکہ ان کی تربیت فرمائی، اسی لیے آپ کی ذات بابرکات ان کے لیے صرف روحانی ہی نہیں بلکہ ادبی سرچشمہ بھی ثابت ہوئی اور آپ کی صحبت کیمیا اثر سے ان دونوں کے شاعرانہ ذوق میں جلا ہوتی رہی ،

مصنف سیر الاولیاء کے بیان کے مطابق آپ نے خسرو کو مشورہ دیا کہ اصفہانیوں کی طرز میں شعر کہا کرو تاکہ کلام عشق انگیز ہو، مرشد کے اس حکم نے سونے پر سہاگے کا کام دیا جس نے ان کے کلام کو سوز باطنی سے معمور کردیا، بعض روایتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خسرو کے کلام میں یہ تاثیر سلطان المشائخ کے لعاب دہن کی برکت کا نتیجہ ہے،

امیر خسرو کو خود اس کا اعتراف ہے کہ انھوں نے جو در معانی بکھیرے ہیں وہ آپ ہی کا فیض ہے،

"این ہمہ معانی کہ در فہم این بیچارہ می انجامد از برکت قوت مخدوم عالمیانست کہ

بنظر مبارک خود این بیچارہ را پرورش می دہند"[1]

دوسری طرف سلطان المشائخ بھی امیر کی شاعرانہ عظمت کے معترف ہیں، جیسا کہ

---

[1] افضل الفوائد، رامپور مخطوطہ، ص ۱۵۸

ذیل کی رباعی سے ظاہر ہے:

خسرو کہ در نظم و نثر مثلش کم خاست	ملکیت ملک سخن آں خسرو راست
ایں خسرو ماست ناصر خسرو نیست	زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

یہ رباعی بھی حضرت سلطان المشائخ کے ذوق سخن کا ثبوت ہے، مرشد کے یہ چار مصرعے خسرو کے لیے ہفت اقلیم کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی ثابت ہوئے ہوں گے، اس تعریف نے ان کے چمنستان تخیل میں کیسے کیسے گلِ رنگین کھلائے ہوں گے،

اس دور کے شعرا میں امیر خسرو اور امیر حسن سب سے زیادہ مشہور ہیں، ایک بار آپ نے خسرو اور حسن دونوں کے کلام کے فرق کو بیان کرتے ہوئے فرمایا

"خسرو دریائے شور است و حسن جوئے شیریں"[۱]

اس مختصر جملہ میں ایسا جامع تبصرہ ہے جس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا، اگر ان دونوں باکمالوں کے کلام کی خوبیوں پر دفتر کے دفتر لکھ ڈالے جائیں تو وہ بھی اسی اجمال کی تشریح ہوگی، اس قسم کے الفاظ گہربار نے اگر ایک طرف دونوں کے لیے شاعری کی ارتقائی منازل طے کرنے میں مشعل راہ کا کام دیا، تو دوسری طرف اس کا بھی ثبوت ہے کہ آپ بہت اعلیٰ پایہ کا ذوق سخن رکھتے تھے، لیکن آپ خود اس لیے شاعری سے احتراز فرماتے تھے کہ آپ کے نزدیک قرآن مجید کی تلاوت شعر گوئی سے بہتر تھی، امیر حسن سجزی لکھتے ہیں:

"حکایت در شعر افتاد بندہ عرضداشت کرد کہ بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید کہ قرآن خواندن بہ شعر گفتن غالب آید ببرکت نفس مخدوم بندہ ہر دو، قرآن می خواند امید آنکہ از آنچہ گفتہ شدہ است و می شود ہم توبہ کردہ آید

[۱] تذکرہ مصنفین دہلی، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۱

ایں عرضداشت پسندیدہ افتاد"[۱]

اس کے باوجود کبھی ذوق و شوق کے عالم میں اشعار کہنے پر مجبور ہو جاتے "نثر عشق" میں آپ کے حالات میں لکھا ہے:

"از علو ہمت و دردمندی و حالت ذوق و شوق گاہے فکر نظم ہم می فرمود"[۲]

اور آپ کی یہ رباعی نقل کی ہے:

از تو نتواند بریدن کس بآسانی مرا	گر نمی داند کسے آخر تو می دانی مرا
گر برنجانی زنجم زانکہ رنجت راحت است	جانی و آرام جاں آندم کہ رنجانی مرا

رباعی کے تیور اور اس کی معنوی کیفیت اس کی شاہد ہے کہ وہ آپ ہی کا کلام بلاغت نظام ہے، افضل الفوائد کی دوشنبہ ۱۶ صفر ۷۱۲ھ کی مجلس میں امیر خسرو دہلوی سے منقول ہے کہ دوران گفتگو میں عشق کا ذکر چھڑ گیا، آپ پر ایک کیفیت اشتیاق طاری ہوئی اور یہ رباعی فرمائی:

گر عشق نبودے و غم عشق نبودے	چندیں سخن نغز کہ گفتے کہ شنیدے
در باد نبودے سر زلفش کہ ربودے	رخسارۂ معشوق بعاشق کہ نمودے

آپ کی ایک نعت جو ذیل کے مطلع سے شروع ہوتی ہے بہت مشہور ہے، اور سوز و گداز اور پاکیزگی میں اپنا جواب نہیں رکھتی ہے

صبا بسوئے مدینہ رو کن ازیں دعاگو سلام برخواں	بگرد شاہ رسل بگرد و بصد تضرع پیام برخواں

فوائد الفواد اور سیر الاولیا میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں، جن سے آپ کی شعر و سخن سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، ایک بار نظم و نثر کا ذکر چھڑ گیا، آپ نے نہایت بلیغ انداز میں

[۱] فوائد الفواد، ص ۲۹ [۲] نثر عشق ص ۱۳۸۳، رام پور مخطوطہ

دونوں کے فرق کو بیان فرمایا۔

"سخن در نظم و نثر افتاد بر لفظ مبارک راند کہ ہر سخن خوب کہ شنیدہ شود ہر آئینہ ذوقے حاصل آید و ہر سخنی کہ بنثر شنیدہ شود ہمان سخنی اگر نظم کردہ سماع افتد ذوقے بیشتر است و الحال خوب ہمیں حکم دارد و ہر سخن خوب کہ شنیدہ شود در شنیدن آں ذوق می باشد اما اگر ہماں سخن در لحن بشنوند ذوق بیشتر است"[1]

عالموں اور ادیبوں نے شعر کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں لیکن سلطان المشائخ نے چند فقروں میں جو تعریف فرمائی ہے اس سے جامع تعریف ممکن نہیں،

"فرمود کہ شعر چیزے لطیف است اما چوں مدح می کنند و بر سرکسے می برند سخت بے ذوق است"[2]

اس سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مدح کرنا اتنا برا نہیں جتنا اسے کسبِ معاش کا ذریعہ بنانا، اسی کے بعد آپ نے علم کی بھی تعریف فرمائی

"و علم نیز ہم چنیں بنفس خویش بس شریف چیزے ست اما چوں آنرا کسب می سازند و بہر ہا می روند عزت آں می رود"[3]

تقریبا ور وعظ کے دوران میں آپ برجستہ اور برمحل اشعار پڑھتے تھے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا مطالعۂ شعری بہت وسیع تھا، اور اساتذہ کے بہت سے اشعار آپ کے حافظ میں محفوظ تھے، ایک بار امیر حسن سجزی نے عشق و محبت کے سلسلہ میں یہ مصرع پڑھا،

ع عشق را ابو حنیفہ درس نکرد

آپ نے فوراً دوسرا مصرع پڑھ دیا

ع شافعی را در و روایت نیست[4]

[1] فوائد الفواد ص ۲۳ [2] ایضاً ص ۱۸۲ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۱۸۶

۲۷ شوال ۷۱۹ھ کی مجلس میں سماع کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، حسن دہلوی نے اس سلسلہ میں اُس رباعی کے آخری دو مصرعے پڑھے جو صاحب مرصاد[؟] نے لکھے ہیں ؎

گفتی کہ بنزدمن حرامست سماع | گر بر تو حرامست حرامست بادا

ہو سکتا ہے کہ شروع کے دو مصرعے امیر حسن کے ذہن سے محو ہو گئے ہوں، آپ نے فوراً پوری رباعی پڑھ دی ؎

دنیا طلبی جہاں بکامت بادا | واں جیفۂ مردار مدامت بادا
گفتی کہ بنزدمن حرامست سماع | گر بر تو حرام است حرامست بادا[1]

ایک مرتبہ آپ کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی، اس لیے کمبل کو دوہرا کرکے اس پر بیٹھے اور حاضرین محفل سے اس کے لیے معذرت چاہی، تو تمام حاضرین نے دعا کی اور کہا کہ ہم آپ کی زندگی اس لیے چاہتے ہیں ہم لوگوں کی زندگیوں کا دارومدار آپ کی حیات پر ہے، حسن کو موقع کی مناسبت سے ذیل کا شعر یاد آ گیا

جاں جانیاں توئی دشمن جاں بو کے | ایں ہمہ دشمنان تو دشمن جان خویشتن

آپ نے فوراً اس قصیدہ کا مطلع پڑھ کر سنا دیا ؎

دوش صبوحی ہبرد بلبل مست در چمن | از خوشی صبوحیش گل بدرید پیرہن[2]

اسی مجلس میں حکیم سنائی کا ذکر چھڑ گیا، آپ نے فرمایا کہ شیخ سیف الدین باخرزی نور اللہ مرقدہ کو بار بار فرماتے سنا گیا کہ مجھکو حکیم سنائی کے ایک قصیدہ نے مسلمان بنا دیا، ایک عزیز نے جو اس مجلس میں حاضر تھا، شعر مندرجہ ذیل پڑھ کر کہا کہ یہ شعر اسی قصیدہ کا ہے،

بر سر طور ہوا طنبور شہوت می زنی | عشق مردلن ترانی را بدیں خواری مجوئے

اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ بیت اس بیت سے متصل ہے ؎

خارہائے راہ عیاراں ایں درگاہ را | در کف دستِ عروس عہد عماری مجوئے[3]

[1] فوائد الفواد، ص ۲۲۷ [2] ایضاً ص ۲۵۱ [3] ایضاً ص ۲۵۲

اس سے اشعار کے حفظ میں آپ کی یادداشت کا اندازہ ہوتا ہے،

ایک مجلس میں امیر حسن نے کہا کہ شعرا کیلئے قرآن حکیم میں تو یہ آیا ہے "الشعراء یتبعھم الغاوون" یعنی جو لوگ شعرا کے پیرو ہوتے ہیں وہ گمراہ ہیں، اور میں نے کئی بار آپ کی زبان سے یہ حدیث سنی ان من الشعر لحکمۃ، پس جب اہل شعر اہل حکمت ہوتے ہیں تو انکی پیروی گمراہ کن کس طرح ہے، آپنے فرمایا کہ وہ شعرا جو ہزل، حشو اور ہجو کہتے ہیں انکی پیروی گمراہ کن بتائی گئی ہے، ورنہ صحابۂ کرام مثلاً حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ نے بھی اشعار کہے ہیں، اس کے بعد حسن نے دوسرا سوال یہ کیا کہ شعر میں جو مبالغہ ہوتا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، آپ نے فرمایا کہ ایک مشہور کتاب میں دیکھا گیا ہے کہ جھوٹ پر مواخذہ ہے لیکن وہ جھوٹ جو شعر میں بیان کیا جاتا ہے، اس پر مواخذہ نہیں ہے[1]۔

امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی سے آپ فرمایش کرکے کلام سنتے تھے، آپ کی سماع کی محفلوں میں قوالی زیادہ تر امیر خسرو ہی سناتے تھے، جو ان ہی کی ایجاد بھی ہے،

کبھی کبھی آپ ان دونوں شاعروں کو شعر گوئی کی طرف متوجہ بھی کرتے رہتے تھے، فوائد الفواد کی ۱۱ ذی الحجہ ۷۰۹ھ کی مجلس میں امیر حسن کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ کل جمعہ کے دن عید تھی، اسکی تہنیت میں تم نے کچھ کہا ہوگا، امیر حسن نے عرض کیا کہ اس سے چار دن پہلے نوروز تھا، بندہ نے ایک شعر کہا تھا جس میں نوروز اور عید کا یکجا ذکر کر دیا ہے، اس کے بعد وہ شعر سنایا[2]،

امیر خسرو جب بھی کوئی کتاب تصنیف کرتے تو سب سے پہلے اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے، آپ اسے ہاتھ میں لیکر فاتحہ پڑھتے اور کبھی کبھی کتاب کھول کر چند سطور ملاحظہ بھی فرماتے[3]،

یہ واقعات اسکے شاہد ہیں کہ امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی کی ذہنی تربیت ہی میں نہیں بلکہ شعر و ادب کی اصلاح و ترقی میں بھی سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کا بہت بڑا ہاتھ ہے، جو آپکے ادبی و شعری ذوق کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

[1] فوائد الفواد ص ۹۴ [2] ایضاً ص ۱۲۰ [3] سیر الاولیا ص ۳۰۰

مطبوعات جدیدہ

تاریخ دولت فاطمیہ: مرتبہ مولانا رئیس احمد جعفری، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، ضخامت ۵۰۰ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت [illegible] پتہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور۔

فاطمیۂ مصر کی تاریخ پر اردو میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ڈاکٹر زاہد مرحوم کی کتاب "تاریخ فاطمیین مصر" جو عرصہ ہوا جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی، سب میں زیادہ مفصل اور مبسوط ہے، اب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے رکن اور اردو کے خوشنویس مصنف رئیس احمد صاحب جعفری نے اس موضوع پر یہ نئی ضخیم کتاب مرتب کی ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، حصۂ اول میں فاطمیین کی اجمالی تاریخ، ان کے عقائد و افکار، نظامِ دعوت اس کا تدریجی ارتقاء، تاویل و تفسیر، فرقۂ اسماعیلیہ کی مختصر تاریخ، اس کی مختلف شاخوں اور اس سلسلہ کے دوسرے مباحث پر مفید اور ضروری معلومات ہیں، دوسرے حصہ میں خلفائے فاطمیہ کے حالات و سوانح کا اجمالی مرقع پیش کیا گیا ہے، تیسرے میں انکے نظامِ حکومت کی خصوصیات، فتوحات، سیاسی و تمدنی خدمات، سماجی و معاشرتی اصلاحات، علوم و فنون کی خدمت و ترقی، صنعتی و تعمیراتی کارنامے اور فوجی و مالیاتی نظام اور دوسرے امورِ سلطنت کی تفصیل ہے، آخر میں فاطمی عہد کی صناعیوں کے بعض نمونوں کی تصویریں بھی دی ہیں، فاضل مصنف کے بقول کتاب کا موضوع سیاسی و تمدنی اور علمی تاریخ ہے، اس لیے فاطمیوں

کے عقیدہ و فلسفہ اور دوسرے نزاعی مسائل پر بحث سے پرہیز کیا گیا ہے لیکن غیر ارادی طور پر
کہیں کہیں انداز بیان جانبدارانہ اور بنو فاطمہ کے مقابلہ میں بنو امیہ وغیرہ کی مخالفت میں لہجہ
سخت ہوگیا ہے، ایک جگہ انھوں نے اسماعیلیوں کی ایک زوجیت کے حکم کو سراہا اور تعدد ازدواج
کے متعلق پاکستانی علماء کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے، جو غلط ہونے کے علاوہ بے محل بھی ہے
اس سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور کتاب محنت
سے لکھی گئی ہے، اس سے فاطمی حکومت اور فرقۂ اسماعیلیہ کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے،

اسلام کا نظام امن: مرتبہ مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی تقطیع کلاں،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۸۴، قیمت ھے، پتہ: شعبۂ تصنیف و تالیف
مدرسہ مفتاح العلوم مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ، یو۔ پی

مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے اسلامی نظام کے مختلف پہلوؤں پر کئی مفید کتابیں لکھی ہیں،
یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، جو اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں فاضل مصنف نے اسلام کے
نظامِ امن کی تفصیلات تحریر کی ہیں، شروع کے چند ابواب میں امن کی اہمیت، اسلام سے پیشتر
کی مختلف قوموں اور ملکوں میں امن و امان کے فقدان کا ذکر ہے، اور اس کے مقابلہ میں اسلامی
عہد کے امن، عدل اور مساوات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، اور ان اوصاف و خصوصیات
کو بیان کیا گیا ہے جو اسلام نے حکمرانوں کے لیے ضروری قرار دیے ہیں، اس ضمن میں صحابۂ کرام
اور قرنِ اول کے مسلمانوں کی عملی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد کے ابواب میں
اسلام کے عدل و مساوات پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس کو مذہبِ امن ثابت کیا گیا ہے،
اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کی لڑائیوں کا مقصد بھی قیامِ امن تھا، اس سلسلہ میں دوسرے مذاہب
کے بارہ میں اسلام کی آزادی و رواداری غیر مسلموں کے ساتھ اس کے فیاضانہ برتاؤ، ذمیوں کے

حقوق اور اس کی عالمگیر وحدت، اخوت اور محبت وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، آخر کے ابواب میں
انسان کے جان، مال، عفت عصمت، نسب اور عقل کی اہمیت و حفاظت کے متعلق اسلامی
قانون کی ہدایات اور قتل، فساد، رہزنی، چوری، زنا، بہتان اور شراب نوشی وغیرہ کی
ممانعت اور ان کی روک تھام کے اسباب کے علاوہ تعزیری قوانین کی تفصیل ہے، فاضل
مصنف نے قرآن و حدیث، اسلامی تاریخ اور لٹریچر کے علاوہ غیر مسلم مصنفین کے بیانات
بھی نقل کیے ہیں، گو اس موضوع پر اردو زبان میں کافی ذخیرہ موجود ہے، تاہم مصنف نے
ہر مبحث پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور اس حیثیت سے یہ کتاب بہت مفید ہے،

امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی: از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب،
تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات ۶۲، قیمت عہ/۲۵ پیسے، پتہ:
حبیب اینڈ کمپنی، ۷/۶ کٹل منڈی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے عرصہ ہوا یہ مفید اور پر از معلومات مقالہ تحریر فرمایا تھا، جو کئی مرتبہ
شائع ہو چکا ہے، معارف میں اس پر ریویو بھی کیا جا چکا ہے، موجودہ اڈیشن نظر ثانی اور
مزید اضافہ و ترمیم کے بعد خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، اس لیے پہلے اڈیشنوں کے
مقابلہ میں زیادہ جامع و مفید بن گیا ہے، اس اڈیشن میں یہ فقرہ "وہ (آنحضور) شہر (مکہ) کے ایک
جونیر گھرانے کے جونیر رکن تھے" دراصل مستشرقین کا الزام ہے، خاص طور پر کھٹکا، مولانا شبلی نے
سیرۃ النبی جلد اول میں اس کی تردید کی ہے،

حضرت اکبر کے شب و روز: از جناب محمد رحیم صاحب دہلوی، تقطیع خورد،
کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، صفحات ۲۷۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ، پتہ:
مکتبہ رضیہ جناح، ہاؤس لارنس روڈ، کراچی ۳

اکبر الہ آبادی مرحوم پر بہت لکھا جا چکا ہے، اس نئی کتاب میں مؤلف نے جدت سے کام لیا ہے، اور اکبر مرحوم کے خطوط سے ان کے حالات، مذہب، ادب، تعلیم، سیاست اور دوسرے مسائل کے متعلق ان کے خیالات اس میں جمع کیے ہیں، اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، اس طرح اس کی حیثیت اکبر کی کہانی خود ان کی زبانی یا ان کے خود نوشت روزنامچہ کی سی ہے، جو ان کے سوانح و افکار اور شاعری اور اس عہد کے واقعات کے متعلق ایک مستند دستاویز ہونے کے علاوہ ان کے شگفتہ اور ظریفانہ طرزِ نگارش کا دلچسپ نمونہ بھی ہے، خواجہ حسن نظامی مرحوم کی کتاب "غالب کا روزنامچہ غدر کے بعد" اس طرز کی یہ دوسری کتاب ہے، شروع میں ملا واحدی کے شگفتہ قلم نے تعارف اور مرتب نے مبسوط پیش لفظ لکھا ہے،

نوائے شوق: مرتبہ پروفیسر واحد ادیب صاحب ایم اے، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۱۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ: پروفیسر واحد ادیب، دانشمندان، امروہہ یوپی

یوسف علی خاں صاحب یوسف ریاست رامپور کے ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں، وہ اردو کی مختلف اصنافِ سخن کے علاوہ فارسی میں بھی دادِ سخن دیتے ہیں، لیکن غزل سے خاص ان کو مناسبت ہے، نوائے شوق ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے، اس میں چار فارسی غزلیں بھی ہیں، یوسف صاحب کا تغزل ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے، شروع میں واحد ادیب صاحب کے قلم سے طویل مقدمہ ہے جو شاعر کے حالات، شاعری پر تبصرہ اور مجموعہ کی اشاعت کی روداد وغیرہ پر مشتمل ہے، تبصرہ میں ایک حد تک مبالغہ سے کام لیا گیا ہے،

"ض"

جلد ۹۹۔ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۷ء۔ عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات